جلد(۸) عدد (۳)
ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہارِ حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] جلد (سکہ) انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] سکہ انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ جلد ۸ - عدد (۳)

اشارات -	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۹۳
مقالات:		
بشارات الانبیاء	جناب مولوی فضل حق صاحب	۲۰۲
قرآنی نظریہ سلطنت	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۲۲۳
تنزیل و تاویل -		
ایاک نعبد و ایاک نستعین	جناب مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی	۲۴۰
رسائل و مسائل -		
سود، پردہ، طلاق اور مہر	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۴۹
مطبوعات -		۲۷۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

"عقلیت" اور "فطریت"، یہ دو چیزیں ہیں جن کا اشتہار، گذشتہ دو صدیوں سے مغربی تہذیب بڑے زور شور سے دے رہی ہے۔ اشتہار کی طاقت سے کون انکار کر سکتا ہے جس چیز کو پیہم اور مسلسل اور بکثرت، نگاہوں کے سامنے لایا جائے اور کانوں پر مسلط کیا جائے، اس کے اثر سے انسان اپنے دل اور دماغ کو کہاں تک بچائیگا اور کب تک بچاتا رہے گا۔ بالآخر اشتہار کے زور سے دنیا نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ مغربی علوم اور مغربی تمدن کی بنیاد سراسر عقلیت اور فطریت پر ہے حالانکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد نہ عقلیت پر ہے اور نہ اصول فطرت کی متابعت پر، بلکہ اس کے برعکس اس کا پورا ڈھانچہ حس اور خواہش اور ضرورت پر قایم ہے۔ مغرب کی نشأۃ جدیدہ دراصل عقل اور فطرت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس نے معقولات کو چھوڑ کر محسوسات اور مادیات کی طرف رجوع کیا۔ عقل کے بجائے حس پر اعتماد کیا۔ عقلی ہدایت اور منطقی استدلال اور فطری وجدان کو رد کر کے محسوس مادی نتائج کو اصلی و حقیقی معیار قرار دیا۔ فطرت کی رہنمائی کو مردود ٹھیرا کر خواہش اور ضرورت کو اپنا رہنما بنایا۔ ہر اس چیز کو بے اصل سمجھا جو ناپ اور تول میں نہ آسکتی ہو۔ ہر اس شئے کو ہیچ اور ناقابل اعتنا قرار دیا جس پر کوئی محسوس مادی منفعت مترتب نہ ہوتی ہو۔ ابتدا میں یہ

حقیقت خود اہل مغرب سے چھپی ہوئی تھی، اس لیے وہ عقل اور فطرت کے خلاف چلنے کے باوجود یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے جس "روشن خیالی" کے دورِ جدید کا افتتاح کیا ہے اس کی بنا "عقلیت" اور "فطریت" پر ہے۔ بعد میں اصل حقیقت کھلی مگر اعتراف کی جرأت نہ ہوئی۔ منافقت کے ساتھ مادہ پرستی اور خواہشات کی غلامی، اور مطالبات نفس و جسد کی بندگی پر عقلی استدلال اور ادعائے فطریت کے پردے ڈالے جاتے رہے لیکن اب انگریزی محاورے کے مطابق "بلی تھیلے سے بالکل باہر آچکی ہے"! غیر معقولیت اور خلاف ورزی فطرت کی لے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس لیے اب کھلم کھلا عقل اور فطرت دونوں سے بغاوت کا اعلان کیا جارہا ہے، علم اور حکمت کی مقدس فضا سے لے کر معاشرت، معیشت، اور سیاست تک ہر جگہ بغاوت کا عَلَم بلند ہوچکا ہے، اور "قدامت پرست" منافقین کی ایک جماعت کو مستثنیٰ کرکے دنیائے جدید کے تمام رہنما اپنی تہذیب پر صرف خواہش اور ضرورت کی حکمرانی تسلیم کر رہے ہیں۔

مشرقی متغربین و متفرنجین اپنے پیشواؤں سے ابھی چند قدم پیچھے ہیں۔ ان کا دماغی نشوونما جس تعلیم اور جس ذہنی فضا اور جن عوامل تہذیب و تمدن کے زیر اثر ہوا ہے ان کا اقتضا یہی ہے کہ وہی محسوسات و مادیات کی پرستش اور خواہشات و ضروریات کی غلامی ان میں بھی پیدا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہو رہا ہے، مگر ابھی تک یہ اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں بلی تھیلے سے باہر آجاتی ہے۔ اپنی تحریر و تقریر میں یہ اب بھی کہے جارہے ہیں کہ ہم صرف عقل اور فطرت کی رہنمائی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف عقلی استدلال پیش کرو۔ ہم کسی ایسی چیز کو نہ مانیں گے جو عقلی دلائل اور فطری شواہد سے ثابت نہ کردی جائے۔ لیکن ان تمام بلند آہنگیوں کے تھیلے میں وہی بلی چھپی ہوئی ہے جو نہ عقلی ہے نہ فطری۔ ان کے مقالات کا تجزیہ کیجئے تو صاف معلوم

ہو جائیگا کہ معقولات اور فطری وجدانیات کے ادراک سے ان کے ذہن عاجز ہیں جس کو یہ عقلی "فائدہ" کہتے ہیں، اس کی حقیقت پوچھیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد "تجربی فائدہ" ہے۔ اور تجربی فائدہ وہ ہے جو ٹھوس ہو، وزنی ہو، شمار اور پیمایش میں آسکے۔ کوئی چیز جس کا فائدہ ان کو حساب کی امداد سے گن کر یا ترازو کے پلڑوں سے تول کر، یا گز سے ناپ کر نہ بتایا جا سکے اس کو یہ مفید نہیں مان سکتے، اور جب تک اس معنی خاص میں اس کی افادت ثابت نہ کردی جائے اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ان کے نزدیک ایسا فعل ہے جس کو یہ "غیر معقولیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ فطرت کی رہنمائی جس کی پیروی کا ان کو دعویٰ ہے اس کی حقیقت بھی تھوڑی سی جرح میں کھل جاتی ہے۔ فطرت سے مراد ان کے نزدیک انسانی فطرت نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہے جو وجدان اور شہادت قلبیہ سے خالی ہے اور صرف حسّ خواہش اور مطالبات نفس و جسد رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اعتبار کے قابل صرف وہی چیزیں ہیں جو حواس کو متاثر کرسکیں، خواہشات کو تسکین دے سکیں، جسمانی یا نفسانی مطالبات کو پورا کرسکیں، جن کا فائدہ فوراً مشاہدہ میں آجائے اور جن کا نقصان نظروں سے اوجھل ہو یا فائدہ کے مقابلے میں ان کو کم نظر آئے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرتِ انسانی کے مقتضیات سے ہیں جن کی اہمیت کو انسان اپنے وجدان میں پاتا ہے، جن کے فوائد یا نقصانات مادی اور حسّی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں، سو ان کی نگاہ میں وہ اوہام اور خرافات ہیں، ہیچ اور ناقابل اعتنا ہیں۔ ان کو کسی قسم کی اہمیت دینا، بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی تاریک خیالی، وہم پرستی اور دقیانوسیت ہے۔ ایک طرف عقل و فطرت سے یہ انحراف ہے، دوسری طرف عقلیت اور فطریت کا دعویٰ ہے، اور عقل کے دیوالیہ پن کا حال یہ ہے کہ وہ اس اجتماع ضدین کو محسوس تک نہیں کرتی۔

تعلیم و تہذیب فکر کا کم سے کم اتنا فائدہ ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیے کہ اس کے خیالات میں الجھاؤ باقی نہ رہے، افکار میں پراگندگی اور ژولیدگی نہ ہو، وہ صاف اور سیدھا طریق فکر اختیار کر سکے، مقدمات کو صحیح ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکے، تناقض اور خلط مبحث جیسی صریح غلطیوں سے بچ سکے۔ لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہم اپنے عام تعلیم یافتہ حضرات کو دماغی تربیت کے ان ابتدائی ثمرات سے بھی محروم پاتے ہیں۔ ان میں اتنی تمیز بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے اپنی صحیح حیثیت متعین کر لیں، پھر اس حیثیت کے عقلی لوازم کو سمجھیں، اور ان کو ملحوظ رکھ کر ایسا طریق استدلال اختیار کریں جو اس حیثیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان سے گفتگو کیجیے، یا ان کی تحریریں دیکھیے، پہلی نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان کے خیالات میں سخت الجھاؤ ہے۔ بحث کی ابتدا ایک حیثیت سے کی تھی، چند قدم چل کر حیثیت بدل دی، آگے بڑھے تو ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی۔ اثبات مدعا کے لئے مقدمات کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کرنا اور ان کو منطقی اسلوب پر مرتب کرنا تک نہ آیا۔ آغاز سے لیکر اختتام تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دراصل آپ کا مدعا کیا ہے، کس مسئلے کی تحقیق پیش نظر تھی اور کیا آپ نے ثابت کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کے اثر سے موجودہ تعلیم کا میلان زیادہ تر حسیات اور مادیات کی طرف ہے۔ وہ خواہشات کو بیدار کر دیتی ہے، مطلوبات اور ضروریات کے احساس کو ابھار دیتی ہے، محسوسات کی اہمیت کو دلوں میں بٹھا دیتی ہے، مگر عقل اور ذہن کی تربیت نہیں کرتی، تنقید اور تفکر کی صلاحیتوں کو نہیں چمکاتی، تہذیب نفس اور تنویر افکار سے غفلت برتتی ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ مادیات کی طرف غیر معتدل میلان پیدا کر کے ذہن کا توازن بگاڑ دیتی ہے۔ اس تعلیم سے مزین ہو کر جو لوگ نکلتے ہیں ان میں تعقل اور تفکر کا پندار تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اور یہی پندار ان کو ہر چیز پر عقلی تنقید کرنے اور ہر اس چیز سے انکار کر دینے پر آمادہ کرتا ہے جو ان کی عقل میں نہ سمائے، مگر درحقیقت

ان کا ذہن عقلیت سے منحرف ہوتا ہے، اور صحیح عقلی طرق پر کسی مسئلے کو سلجھانے یا کسی امر میں رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

اس غیر معقول "عقلیت" کا اظہار سب سے زیادہ ان مسائل میں ہوتا ہے جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جن کے روحانی و اخلاقی اور اجتماعی و عمرانی مبادی مغرب کے نظریات سے ہر ہر نقطہ پر متصادم ہوتے ہیں۔

آپ کسی جدید تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجئے اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لئے پہلے اس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجئے، پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجئے۔ وہ فوراً اپنے شانے ہلائیگا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ "یہ ملائیت ہے۔ میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ اگر تمہارے پاس معقولات نہیں، صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا"۔ بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے۔ اس غریب کو برسوں کی تعلیم اور تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ مسلمان ہوگا یا کافر ہوگا۔ اگر مسلمان ہے تو مسلمان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ خدا کو خدا، اور رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہے، اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول جو کچھ حکم پہنچائے گا اس کی اطاعت وہ بے چون و چرا کرے گا۔ اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجت عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں۔ بحیثیت مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ کوئی خاص حکم رسول خدا نے دیا ہے یا نہیں۔ جب حجت نقلی سے یہ ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہئے

وہ اپنے اطمینانِ قلب اور حصولِ بصیرت کے لئے حجتِ عقلی کی درخواست کرسکتا ہے مگر اُس وقت جبکہ وہ امتثالِ امر کر چکا ہو۔ امتثالِ امر کے لئے حجتِ عقلی کو شرط قرار دینا، اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل رسولِ خدا کی حاکمیت (اتھارٹی) کا انکار کر رہا ہے اور یہ انکار مستلزم کفر ہے۔ حالانکہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے صحیح جائے قیام دائرۂ اسلام کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ سب سے پہلے اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اس سے نکل جائے۔ اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائیگا کہ حجتِ عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے

یہ قاعدہ عقلِ سلیم کے مقتضیات میں سے ہے اور دنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قایم نہیں ہو سکتا۔ کوئی حکومت ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے ہر حکم پر حجتِ عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعتِ امر سے انکار کر دے۔ کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں بن سکتی اگر اس کا ہر سپاہی اپنے جنرل کے ہر حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب کو اطاعت کے لئے شرط قرار دے۔ کوئی مدرسہ، کوئی کالج کوئی انجمن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں بن سکتا کہ ہر ہر جزئی حکم پر ہر ہر فرد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے، اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے۔ انسان جس نظام میں بھی داخل ہوتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کے اقتدارِ اعلیٰ پر کلی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے۔ اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا ایک جزء رہے اس کا فرض

ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت کرے، خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔ مجرمانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امرِ دیگر ہے۔ ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کرکے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں بھی اپنے ذاتی اطمینان کو اطاعت کے لئے شرط قرار دیتا ہے تو درِاصل وہ "اقتدارِ اعلیٰ" کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور یہ صریح بغاوت ہے۔ حکومت میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائیگا تو اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم کردیا جائے گا۔ فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔ مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائیگی۔ مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لئے کہ اس نوع کے طلب حجت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے طالبِ حجت کا صحیح مقام اندر نہیں، باہر ہے۔ پہلے وہ باہر نکل جائے پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

اسلام کی تنظیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جتنی حجتیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا "آلہ" ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں اس بنیادی مسئلہ پر صرف کیجئے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو، تو آپ کو داخلِ اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔ اور نہ احکام اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کرلیا تو آپ کی حیثیت ایک "مسلم" کی ہوگئی، اور "مسلم" کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے، اور احکام کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا انحصار آپ کے اطمینان قلب پر ہو۔ مسلم

بن جانے کے بعد آپ کا فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں۔

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲۴: ۷)

ایمان لانے والوں کا قول صرف یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان، اور ایسی طلب حجت جو تسلیم و اطاعت کے لئے شرط ہو، باہم متناقض ہیں، اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل سلیم کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجت نہیں ہوسکتا اور جو ایسا طالب حجت ہے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ (۳۳: ۵)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

اسلام نے اصلاح اور تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھا دینے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رک گئے، اور جس چیز کا حکم دیا گیا وہ ایک اشارے پر لاکھوں کروڑوں انسانوں میں رائج ہوگئی۔ اگر ایک ایک چیز کے لئے عقلی حجتیں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر اطاعت احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی اخلاق کی اصلاح اور اعمال کی وہ تنظیم نہ ہوسکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے احکام خلاف عقل ہیں یا اس کا کوئی جزئی سے جزئی حکم بھی حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ اسلام اپنے پیروؤں سے اندھوں کی سی تقلید چاہتا ہے، اور احکام کی عقلی و فطری بنیادوں کو تلاش کرنے اور ان کے مصالح و حکم کو سمجھنے سے روکتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی کے لئے تفقہ اور تدبر ضروری ہے جو شخص احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو جتنا زیادہ سمجھے گا وہ اتنا ہی زیادہ صحیح اتباع کرسکے گا۔ ایسے فہم اور ایسی بصیرت سے اسلام روکتا نہیں، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے اُس عقلی تجسس میں جو اطاعت کے بعد ہو، اور اس عقلی امتحان میں جو اطاعت سے پہلے اور اطاعت کے لئے شرط ہو۔ مسلم سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کرتا ہے پھر احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجائے۔ اس کو تو دراصل خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر اطمینان کلی حاصل ہے۔ اس کے بعد وہ بصیرتِ تامہ حاصل کرنے کے لئے جزئیات پر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ اطمینان بھی حاصل ہوجائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو اُس اطمینان کلی کی بنا پر جو اسے خدا اور رسول پر ہے بلا تامل احکام کی اطاعت کئے چلا جاتا ہے۔ اس قسم کی طلب حجت کو اس طلب حجت سے کیا نسبت جو ہر ہر قدم پر پیش کی جائے اور اس داعیہ کے ساتھ پیش کی جائے کہ اگر میرا اطمینان کرتے ہو تو قدم اٹھاتا ہوں ورنہ پیچھے پلٹا جاتا ہوں۔

حال میں ایک تحریر ہماری نظر سے گذری جو ایک "مسلم" جماعت کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ یہ جماعت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مذہب سے منحرف بھی نہیں، بلکہ اپنی دانست میں بڑی مذہبی خدمت انجام دے رہی ہے۔ مذہبی "اصلاح" کے نام سے جن امور کی تبلیغ وہ کرتی ہے اُن میں

سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر سال بقر عید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے روکا جاتا ہے' اور انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو روپیہ وہ جانوروں کو ذبح کرنے پر صرف کرتے ہیں اسے قومی ادارات کی اعانت' یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ اس تبلیغ پر کسی مسلمان نے اعتراض کیا جس کی پوری عبارت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ مگر اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ :

"سوائے نقل و تقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی ... اگر کوئی صاحب اس سے پہلے ہم کو اپنے عقیدۂ قربانی کے عقلی پہلو سے آگاہ فرمائیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہوں گے"۔

یہ تحریر نمونہ ہے اُن لوگوں کی دماغی حالت کا جو اپنے آپ کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ ایک طرف "عقلیت" کا اس قدر زبردست دعویٰ ہے' اور دوسری طرف "غیر عقلیت" کا ایسا شدید مظاہرہ ہے صرف یہی دو فقرے جو قلم مبارک سے نکلے ہیں' اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنی صحیح حیثیت ہی متعین نہیں کی۔ اگر آپ مسلم کی حیثیت سے بول رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے "نقل" کے آگے سر جھکانا چاہیے' پھر عقلی حجت کا مطالبہ کرنے کا آپ کو حق ہوگا' اور وہ بھی شرط اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ محض اطمینان قلب کے لیے' اور اگر آپ اطاعت سے پہلے حجت عقلی کے طالب ہیں اور یہ شرط اطاعت ہے تو آپ کو "مسلم" کی حیثیت سے بولنے کا حق ہی نہیں۔ اس نوع کے طالب حجت کو پہلے ایک غیر مسلم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے' پھر اس کو یہ حق تو حاصل ہوگا کہ جس مسئلے پر چاہے اعتراض کرے' مگر یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے کسی امر دینی میں مفتی اسلام بن کر فتویٰ صادر کرے۔ آپ ایک ہی وقت میں اِن دونوں متضاد حیثیتوں کو اختیار کرتے ہیں اور ایک حیثیت کے بھی عقلی لوازم پورے نہیں کرتے۔ ایک طرف آپ نہ صرف "مسلم" بلکہ مفتی اسلام بنتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کا حال

یہ ہے کہ "نقل" کو آپ ہیچ سمجھتے ہیں۔ حکم کا "حکم" ہونا آپ پر نقل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ مگر آپ اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ پہلے اس حکم کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے، بالفاظ دیگر آپ کسی حکم کو محض حکم خدا و رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں مانیں گے بلکہ اس کے عقلی و تجربی فوائد کی بنا پر مانیں گے۔ اگر ایسے فوائد معلوم نہ ہوسکیں یا آپ کے معیار پر وہ "فوائد" ثابت نہ ہوں تو آپ حکم کو رد کر دیں گے بلکہ اس کے خلاف پروپگنڈا بھی کریں گے، اس کو "بے محل" "بے معنی" "فضول بلکہ مضر" اور "مسرفانہ رسم" قرار دیں گے اور مسلمانوں کو اس کے اتباع سے روکنے میں اپنی قوت صرف کریں گے۔ کونسی عقل ہے جو اس متناقض طرز عمل اور متضاد حیثیات کے اختلاط کو جائز رکھتی ہے۔ حجت عقلی کا مطالبہ بجا و درست۔ مگر پہلے یہ تو ثابت کیجئے کہ آپ ذوی العقول میں سے ہیں۔

عقلی اور "تجربی" فائدہ کسی ایک مخصوص اور متعین چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک نسبی و اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کی عقل ایک چیز کو مفید سمجھتی ہے دوسرے کی عقل اس کے خلاف حکم لگاتی ہے۔ تیسرا شخص اس میں کسی نوع کا فائدہ تسلیم کرتا ہے مگر اس کو اہمیت نہیں دیتا اور ایک دوسری چیز کو اس سے زیادہ مفید ٹھیراتا ہے۔ تجربی فوائد میں اس سے بھی زیادہ اختلاف کی گنجایش ہے۔ فائدے کے متعلق ہر شخص کا نظریہ الگ ہے، اور اسی نظریہ کے لحاظ سے وہ اپنے یا دوسروں کے تجربات کو مرتب کر کے مفید یا غیر مفید ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ ایک شخص نفع عاجل کا طالب ہے اور صرف ضرر عاجل کو قابل حذر سمجھتا ہے۔ اس کا انتخاب ایسے شخص کے انتخاب سے یقیناً مختلف ہوگا جس کی نظر مآل کار پر ہو۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایک نوع کا فائدہ اور دوسری نوع کی مضرت ہے۔ ایک شخص ان کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ فائدہ کی خاطر مضرت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوسرا شخص ان سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اس کی رائے میں ان کی مضرت ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ پھر عقلی اور تجربی فوائد میں بسا اوقات تخالف پایا جاتا ہے۔ ایک چیز تجربی حیثیت سے

مضر ہے مگر عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کسی بڑے عقلی فائدے کے لئے اس مضرت کو برداشت کرنا چاہیئے۔ ایک دوسری چیز ہے جو تجربی حیثیت سے مفید ہے مگر عقل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ کسی عقلی مضرت سے بچنے کے لئے اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایسے اختلافات کی موجودگی میں کسی چیز کے "عقلی" اور "تجربی" فوائد پر کوئی ایسی روشنی ڈالنی ممکن ہی نہیں جس سے تمام لوگ اس کے مفید ہونے پر متفق ہو جائیں اور انکار کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ محض ایک قربانی پر کیا موقوف ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور اوامر ونواہی شریعت میں سے کونسی چیز ایسی ہے جس کے عقلی اور تجربی فوائد پر ایسی روشنی ڈال دی گئی ہو کہ وہ کالشمس فی النہار نظر آنے لگے ہوں اور تمام لوگوں نے ان کو تسلیم کر کے ان کی پابندی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ایک شخص بھی دنیا میں تارک صوم وصلوٰۃ اور منکر حج وزکوٰۃ نہ ہوتا۔ اسی لئے اسلام نے اپنے احکام کو ہر شخص کی عقل اور اور تجربہ کے فتوے پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ ایمان اور اطاعت کو اساس بنایا ہے۔ مسلم عقلی اور تجربی فوائد پر ایمان نہیں لاتا بلکہ خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے اس کا مذہب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کا فائدہ عقل وتجربہ سے ثابت ہو جائے تب وہ اس کو قبول کرے، اور کسی چیز کی مضرت عقلی وتجربی حیثیت سے مبرہن ہو جائے تب وہ اس سے اجتناب کرے۔ بلکہ اس کا مذہب یہ ہے کہ جو حکم خدا اور رسول سے ثابت ہو جائے وہ قابل اتباع ہے، اور جو حکم ثابت نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں ہے۔

پس یہاں اصلی سوال یہی ہے کہ آپ کا ایمان عقل اور تجربہ پر ہے یا خدا اور اس کے رسول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو آپ کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر آپ کو مسلمان بن کر گفتگو کرنے اور مسلمانوں کو ارض غیر ذی زرع کی نام نہاد سنت سے اجتناب کا مشورہ دینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر دوسری بات ہے تو مدار بحث عقلی وتجربی فوائد نہ ہونے چاہئیں بلکہ یہ سوال ہونا چاہیئے کہ آیا قربانی محض ایک رسم ہے جس کو مسلمانوں نے گھڑ لیا ہے یا ایک عبادت ہے جس کو اللہ نے پسند فرمایا اور اللہ کے رسول نے اپنی امت میں جاری کیا؟

مقالات

بشارات الانبیاءؑ

نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں

(۳)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

گذشتہ دو اشاعتوں میں جو آٹھ مقدمات بیان کیے گئے ہیں، امید ہے کہ وہ ناظرین کے پیش نظر ہوں گے۔ اب ہم ان اٹھارہ بشارتوں کو نقل کر کے ہر ایک پر مفصل کلام کریں گے، جو اہل کتاب کی معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی بشارت

کتاب استثنا، باب ۱۸ میں ہے:-

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاوے۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں

کیوں کر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں۔ تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر (آیت ۱۷-۲۲)۔

اس کا مصداق کون ہے | احبار یہود کہتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت یوشع علیہ السلام کے حق میں ہے۔ پروٹسٹنٹ علماء حضرت عیسیٰ کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ لیکن بشارت کے الفاظ اور دوسرے قرائن بتا رہے ہیں کہ اس کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

۱- اپنے تیسرے مقدمہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں بھی یہودی اس نبی کی آمد کے منتظر تھے جس کی بشارت اس باب میں دی گئی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ یوشع علیہ السلام کو اس پیشین گوئی کا مصداق ٹھیرانے کا خیال حضرت عیسیٰ کے زمانے تک یہودیوں کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب عیسائیوں نے اس کو جناب مسیح پر چسپاں کیا تو یہودیوں نے ان کی ضد میں حضرت یوشع کو اس کا مصداق قرار دینے کی کوشش کی۔

۲- بشارت میں لفظ "تجھ سا" استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ وہ آنے والا نبی حضرت موسیٰ کے مانند ہوگا مگر حضرت یوشع اور حضرت عیسیٰ دونوں میں سے کوئی بھی حضرت موسیٰ کے مانند نہیں ہے۔ اول تو خود توراۃ ہی میں یہ تصریح ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ علیہ السلام کے مانند نہیں اُٹھا۔

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔ (استثناء باب ۳۴- آیت ۱۰)۔

دوسرے یوشع علیہ السلام کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اور موسیٰ علیہ السلام میں

کوئی مماثلت نہیں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ایک کتاب اور نئی شریعت لائے جو امر و نہی کے احکام پر مشتمل تھی، اور یوشع علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے بلکہ شریعت موسوی کے تابع رہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ میں بھی پوری مماثلت نہیں پائی جاتی، کیونکہ نصاریٰ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام تو اِلٰہ اور خداوند تھے اور موسیٰ علیہ السلام خداوند کے بندے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیرووں کے اعتقاد کی رو سے اپنی امت کے بدلے میں لعنت کیے گئے، جیسا کہ پولوس نے گلتیوں کے نام اپنے خط میں تصریح کہا ہے (دیکھو گلتیوں باب ۳ - آیت ۱۳) مگر موسیٰ علیہ السلام کبھی لعنت نہیں کیے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام مرنے کے بعد دوزخ میں ڈالے گئے جیسا کہ اہل تثلیث کے عقائد میں بالفاظ صریح بیان کیا گیا ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام دوزخ میں نہیں گئے۔ حضرت عیسیٰ کو حسب اعتقاد نصاریٰ صلیب دی گئی تاکہ وہ اپنی امت کے لیے کفارہ بنیں، لیکن حضرت موسیٰ کو نہ صلیب دی گئی اور نہ وہ کسی کے لیے کفارہ بنے۔ سب سے بڑی چیز جو ان دونوں میں مثلیت کی نفی کرتی ہے، یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی شریعت لائے جو حدود اور تعزیرات اور احکام غسل و طہارت اور امتیاز حلال و حرام پر مشتمل تھی۔ بخلاف اس کے عیسیٰ علیہ السلام کا مذہب ان سب چیزوں سے خالی ہے، جیسا کہ عیسائیوں کی انجیلوں سے ظاہر ہے۔ پھر یہ فرق بھی نمایاں ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم میں فرمانروا تھے اور ان کے امر و نہی کا نفاذ ایک بادشاہ کے احکام کی طرح ہوتا تھا۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام ایسے نہ تھے۔

۳۔ اس بشارت میں نبی موعود کی دوسری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "اُن کے بھائیوں میں سے" ہوگا۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس وقت ۱۲ اسباط سب کے سب موسیٰ علیہ السلام کے پاس موجود تھے۔ پس اگر مقصود یہ ہوتا کہ نبی موعود انہی میں سے کسی کی نسل میں پیدا ہوگا تو "اُن کے بھائیوں میں سے" نہ کہا جاتا بلکہ "اُن میں سے" کہا جاتا۔ ان کے بھائیوں میں سے کہنے کے صاف

یعنی یہ ہیں کہ نبی موعود ۱۲ اسباط میں سے کسی کی بھی صلب سے نہ ہوگا۔ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد توراۃ میں متعدد مقامات پر حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد ہیں۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۶ - آیت ۱۲ میں حضرت ہاجرہ سے اللہ تعالیٰ کے جس وعدہ کا ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں :-

"وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا"

اسی کتاب کے باب ۲۵ - آیت ۱۸ میں اولاد اسماعیل کے نام گنانے کے بعد لکھا ہے :-

"اور وے حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا"

یہاں اولاد اسماعیل کے بھائیوں سے مراد بنی اسحاق ہیں۔

پھر کتاب گنتی کے باب ۲۰ آیت ۱۴ میں ہے۔

"تب موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایلچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وے سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑیں تو جانتا ہے"

اور استثناء باب دوم میں ہے :-

"پھر خداوند نے مجھے خطاب کر کے فرمایا ..... اور تو ان لوگوں سے کہہ کہ تم کو اب اپنے بھائیوں بنی عیسو کے سوانوں پر ہو کے گذرنا ہوگا - وے شعیر میں رہتے ہیں اور وے تم سے ہراساں ہوں گے .... سو جب ہم اپنے بھائیوں بنی عیسو کے سامنے سے جو شعیر میں رہتے ہیں میدان کی راہ سے ایلات اور عصیون جبر سے ہو کے گذر گئے الخ" (آیت ۲ - ۴ - ۸) -

یہاں بنی اسرائیل کے بھائیوں سے بنی عیسو بن اسحاق مراد ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک

نہیں کہ بنی عیسو بھی بنی اسرائیل ہی میں سے ہیں! اور ان کے لیے بنی اسرائیل کے بھائیوں کا لفظ جو توراۃ کے بعض مقامات میں استعمال ہوا ہے، محض ایک مجازی استعمال ہے، اور حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی لینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ لفظ کو معنی حقیقی پر محمول کرنے میں کوئی مانع قوی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی قوی کیا ضعیف مانع بھی نہیں ہے، لہذا یوشع اور عیسیٰ علیہما السلام جو خود بنی اسرائیل میں سے تھے، وہ نبی موعود نہیں ہو سکتے جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے آنے والا تھا۔

۴۔ بشارت میں کہا گیا ہے کہ "ایک نبی برپا کروں گا"۔ لیکن یوشع علیہ السلام اس وقت حضرت موسیٰ کے پاس حاضر، اور بنی اسرائیل میں داخل، اور نبوت سے سرفراز تھے۔ پھر ان پر لفظ "برپا کروں گا" کیسے صادق آسکتا ہے۔

۵۔ بشارت میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا"۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اس نبی پر کتاب نازل ہو گی اور وہ امّی ہو گا جس کو کلام زبانی یاد کرایا جائے گا۔ یہ دونوں باتیں حضرت یوشع میں نہیں پائی جاتیں۔ لہذا اس وجہ سے بھی یہ بشارت ان سے متعلق نہیں ہو سکتی۔

۶۔ بشارت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ "جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا"۔ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں "حساب لوں گا" کے بجائے اکون المنتقم من ذالك لکھا ہے، یعنی میں اس سے اس کا انتقام لوں گا" انگریزی ترجمہ میں (I will require it of him,) کے الفاظ لکھے ہیں، یعنی "میں اس سے اس کا محاسبہ کروں گا" یہ بات اُن امتیازی خصوصیات میں سے ہے جن کو موعود کی علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یعنی اولاً وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے

ہوگا، ثانیاً وہ موسیٰ کے مانند ہوگا ثالثاً اس کے منہ میں اللہ اپنا کلام ڈالے گا رابعاً جو کوئی اس کی بات نہ سنے گا اس سے اللہ تعالیٰ انتقام لے گا یا محاسبہ کرے گا۔ اس کے بعد دوسری علامتیں بھی بتائی گئی ہیں اور یہ سب ایسی علامتیں ہیں اور ہونی چاہئیں جن کا ظہور لوگوں کے سامنے ہو تاکہ وہ اس نبی کو دوسرے انبیاء سے ممتاز کرسکیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین سے اللہ تعالیٰ کے جس انتقام یا محاسبہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد اخروی عذاب نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ نہ تو انکار نبی پر آخرت کا عذاب کسی خاص نبی کے منکرین کے لیے مختص ہے (وہ تو تمام انبیاء کے منکرین کے لیے عام ہے) اور نہ منکرین پر آخرت کا عذاب کوئی ایسی علامت ہے جس سے اس دنیا میں کسی نبی کو دوسرے انبیاء سے ممتاز کیا جاسکتا ہو۔ لہٰذا یہاں انتقام اور محاسبہ سے مراد لازماً اسی دنیا کے اندر انتقام اور محاسبہ ہونا چاہیے۔ اور یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو وہ قوت دی ہی نہیں گئی تھی جس سے وہ انکار کرنے والوں کو کسی قسم کی سزا دے سکتے۔ ان کی شریعت احکام حدود و قصاص اور تعزیر و جہاد سے خالی ہے۔

۷۔ کتاب الاعمال کے باب سوم میں ہے۔

"پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں۔ اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ضرور ہے کہ آسمان اُسے لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میرے مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائیگا۔" (آیت ۱۹ تا ۲۳)

یہ عبارت صاف دلالت کر رہی ہے کہ یہ نبی موعود عیسیٰ علیہ السلام کے ماسوا ہے، اور یہ کہ اس نبی کے ظہور تک ضرور ہے کہ آسمان عیسیٰ علیہ السلام کو لیے رہے۔ جو کوئی مسیحیت کے باطل تعصب سے خالی ہو کر پطرس کی اس عبارت پر غور کرے گا اس پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ پطرس کا یہی قول مسیحی علماء کے اس دعوے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ بشارت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے۔ یہ ساتوں وجوہ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری طرح صادق آتی ہیں۔

اولاً آنحضرت صلعم بہت سے امور میں موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ مثلاً آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں جس طرح موسیٰ علیہ السلام تھے۔ آپ ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ نکاح کیے اور صاحب اولاد ہوئے۔ آپ کی شریعت سیاسات مدنیہ پر مشتمل ہے۔ آپ جہاد پر مامور ہوئے۔ آپ کی شریعت میں عبادت کے لیے طہارت لازم کی گئی۔ آپ کی شریعت میں جنبی اور حائضہ اور نفساء کے لیے غسل واجب کیا گیا۔ آپ کے یہاں لباس کو بول و براز سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا۔ آپ کی شریعت میں اس جانور کا کھانا حرام کیا گیا جو ذبح نہ کیا گیا ہو یا جس کو بتوں پر قربان کیا گیا ہو۔ آپ کے ہاں بدنی عبادات و جسمانی ریاضات کا حکم دیا گیا۔ آپ کو زنا کی حد جاری کرنے کا حکم دیا گیا۔ حدود اور تعزیرات اور قصاص کے احکام دیے گئے اجرائے حدود کی قوت آپ کو دی گئی۔ سود حرام کیا گیا۔ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف دعوت دینے والوں سے مقابلہ پر آپ مامور ہوئے۔ توحید خالص کی تعلیم آپ کے ذریعہ سے دی گئی۔ آپ کی امت کو حکم دیا گیا کہ وہ آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول کہے نہ کہ ابن اللہ یا خداوند۔ آپ نے طبعی موت سے وفات پائی اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح دفن کیے گئے۔ آپ اپنی امت کی خاطر لعنت نہیں کیے گئے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن میں عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مماثلت

پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی موسیٰ علیہ السلام) کو بھیجا تھا۔

ثانیاً آپ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔

ثالثاً آپ پر کتاب نازل ہوئی اور اللہ کا کلام آپ کے منہ میں ڈالا گیا کیونکہ آپ امی تھے۔

رابعاً آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہ کہا بلکہ جو کچھ آپ پر وحی کیا گیا وہی کہا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

خامساً آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اور اسی ذریعہ سے اللہ نے صنادید قریش اور قیاصرہ واکاسرہ اور ان سب سے انتقام لیا جنہوں نے وہ باتیں نہ سنیں جو آپ نے اللہ کی طرف سے ان کو سنائی تھیں۔

سادساً آپ نزول مسیح سے قبل تشریف لائے اور آسمان کے لیے ضرور ہوا کہ آپ کے ظہور تک حضرت مسیح کو لیے رہے۔

سابعاً آپ ہی کے ذریعہ سے وہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا تھا اپنی حالت پر پلٹ آئیں۔ شرک اور بت پرستی کی جڑ اس طرح کٹ گئی کہ دنیا میں اب کوئی مذہب فروغ نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ توحید کو بطور اصل الاصول کے تسلیم نہ کرے۔

۸۔ اس بشارت میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ جو بھی اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرے گا جن کا اسے حکم نہیں دیا گیا ہے وہ قتل کیا جائیگا۔ آپ دیکھو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ

اللہ تعالیٰ کے نام سے کہا وہ اگر فی الواقع اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو آپ ضرور قتل کیے جاتے جو قرآن میں بھی وہی بات کہی گئی ہے۔ جو تورات میں ارشاد ہوئی ہے۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔ لیکن چونکہ آپ نے سب کچھ سچ سچ اللہ ہی کی طرف سے کہا اس لیے آپ قتل نہ کیے گئے، اللہ نے آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے کا ذمہ لیا۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ آپ کے ہزاروں لاکھوں دشمنوں میں سے کوئی بھی آپ پر قابو نہ پا سکا یہاں تک کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ بخلاف اس کے خود عیسائیوں کے قول کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام قتل کیے گئے اور صلیب پر چڑھائے گئے۔ اس سے بڑھ کر غیر معقول بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول و مصلوب ہونے کا بھی اقرار کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ پیشین گوئی بھی آپ کے حق میں چسپاں کرتے ہیں جس میں صاف کہا گیا ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جائیگا۔

۹۔ اس بشارت میں نبی کاذب کی ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ خدا کے نام سے جو خبریں وہ دیگا وہ پوری نہ ہوں گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی خبریں دیں وہ سب پوری ہوئیں۔ بعض کا ظہور آپ کے زمانہ ہی میں ہوگیا مثلاً ایران پر روم کا غلبہ، مشرکین پر خود آپکا فتح یاب ہونا، مسجد حرام میں مسلمانوں کا داخل ہونا۔ اور بعض کی صداقت آپ کے صحابہ کے دور میں ظاہر ہوئی مثلاً مصر اور بلاد قیصر و کسریٰ کی فتح، اور فئۃ باغیہ کی سرکوبی۔ اور بکثرت خبریں ایسی ہیں جن کو آپ کے زمانے کے لوگ سمجھ بھی نہ سکے تھے مگر ازمنۂ مابعد میں پے درپے ان کی صداقت ظاہر ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا اس معیار پر بھی آپ کی نبوت پوری اترتی ہے۔

۱۰۔ علماء یہود میں سے بہتوں نے تسلیم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں جن کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے۔ ان میں سے جو حق پسند تھے وہ مسلمان بھی ہوگئے، اگر جن پر نسلی

تعصب کا غلبہ تھا انہوں نے یہ جان لینے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا بالکل اسیطرح جس طرح قیافانے (جو کاہنوں کا رئیس اور یوحنا کے بقول نبی تھا) عیسیٰ علیہ السلام کا مسیح ہونا جان لینے کے باوجود آپ سے کفر کیا اور آپ کے قتل کا فتویٰ دیا (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۱ و باب ۱۸)

حدیث میں مخیریق یہودی کے متعلق مروی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی صفات اور آثار نبوت سے پہچان لیا تھا۔ مگر اس پر اپنے مذہب کی الفت غالب آگئی اور وہ اسی کا متبع رہا یہاں تک کہ جب احد کی لڑائی کا دن آیا۔ (اور وہ یوم السبت تھا) تو اس نے کہا کہ اے قوم یہود خدا کی قسم تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تم پر محمدؐ کی فتح یقیناً ہو گی۔ لوگوں نے کہا کیا اس وجہ سے کہ آج سبت کا دن ہے۔ اس نے کہا سبت کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور لڑنے نکلا۔ چلتے چلتے اس نے وصیت کی کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالہ کر دیا جائے۔ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ جب وہ مارا گیا تو حضور نے فرمایا مُخیریق بہترین یہودی تھا اس کے اموال آپ کے قبضہ میں آئے اور مدینہ میں صدقات رسول اللہ صلعم کا بیشتر حصہ انہی پر مشتمل تھا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدارس تشریف لے گئے اور فرمایا تم میں جو سب سے زیادہ عالم ہو اس کو لاؤ۔ انہوں نے کہا وہ عبد اللہ بن صوریا ہے۔ آنحضرت صلعم اس کو خلوت میں لے گئے اور اس کو دین موسیٰ اور ان نعمتوں کی قسم دی جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور اس سے پوچھا کیا تو جانتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا یقیناً آپ رسول اللہ ہیں اور جو کچھ میں سمجھتا ہوں وہی دوسرے یہودی بھی سمجھتے ہیں آپ کی صفات اور نشانیاں توراۃ میں صاف مذکور ہیں، مگر وہ آپ سے حسد رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا پھر تجھ کو کس چیز نے

روک رکھا ہے۔ اس نے کہا میں اپنی قوم کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا بعید نہیں کہ وہ آپکا اتباع قبول کرکے مسلمان ہوجائیں، پھر میں بھی اسلام لے آونگا۔

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور قبا پر اترے تو میرے باپ اور چچا حیی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب دوسرے روز صبح سویرے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آفتاب غروب ہونے تک وہیں رہے مغرب کے بعد وہ پلٹے تو اس طرح کہ تکان اور ضعف کے مارے گرے پڑتے تھے۔ میں دوڑکر ان کے پاس گئی۔ مگر ان میں سے کسی نے میری طرف التفات نہیں کیا کیوں کہ انؔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میرے چچا ابویاسر نے میرے باپ سے کہا کیا واقعی یہ شخص وہی نبی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں واللہ۔ اس نے پوچھا کیا تم اس کو اچھی طرح پہچان گئے اور تم کو یقین ہوگیا؟ اس نے جواب دیا ہاں۔ اس نے پوچھا پھر کیا ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا جب تک زندہ ہوں اس کی دشمنی پر قائم رہوں گا۔

چند اعتراضات اب ہم ان اعتراضات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس پیشین گوئی کی مذکورہ بالا تعبیر پر دوسروں کی طرف سے کیے گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی صرف بنی اسماعیل ہی تو نہیں ہیں۔ بنی عیسو بھی ان کے بھائی ہیں حضرت ابراہیم کی بیوی قطورا کی اولاد بھی ان کے بھائیوں میں سے ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب بھی ان کے بھائیوں میں سے ہیں مگر ان میں کون ایسا پیدا ہوا جس پر اس پیشینگوئی کی دوسری علامتیں صادق آتی ہوں؟ پھر توراۃ میں کسی جگہ بھی ان کے متعلق کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ بخلاف اس کے بنی اسماعیل کے حق میں اللہ نے حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ دونوں سے وعدے کیے ہیں جو توراۃ میں مذکور ہیں۔

علاوہ بریں بنی عیسو میں کوئی شخص اس پیشین گوئی کا مصداق نہیں ہوسکتا کیونکہ حضرت اسحاق نے حضرت یعقوب اور ان کی اولاد کو برکت دی اور عیسو اور اس کی اولاد کو برکت دی۔ (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۷)

علماء پروٹسٹنٹ نے دو اعتراض اور کیے ہیں جن کو صاحب المیزان نے اپنی کتاب حل الاشکال فی جواب الاستفسار میں نقل کیا ہے۔

اول یہ کہ کتاب الاستثناء کے باب ۱۸ آیت پندرہ میں جو پیشین گوئی مذکور ہے اس میں آنے والے نبی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا"۔ پس لفظ "تیرے ہی درمیان سے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ نبی اولاد اسرائیل میں سے ہونا چاہیے نہ کہ اولاد اسمٰعیل میں سے۔

دوم یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے خود اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے آپ کو ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا باب ۵ آیت ۴۶ میں ان کا یہ قول مذکور ہے کہ "اگر تم موسیٰ پر ایمان لاتے تو مجھ پر بھی ایمان لاتے اس لیے کہ اس نے میرے حق میں لکھا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ "تیرے ہی درمیان سے" کہنے کے بعد "تیرے ہی بھائیوں میں سے" جب کہا گیا تو صاف ظاہر ہو گیا کہ "تیرے ہی درمیان سے" کہنے کا مقصود دراصل "بنی اسرائیل کے درمیان سے" نہیں ہے بلکہ "ان کے بھائیوں میں سے" ہی ہے۔ پھر یہ بات آگے چل کر اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ آیت اٹھارہ میں جب دوبارہ اس وعدے کو حضرت موسیٰ نے دہرایا تو یوں کہا کہ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" یہاں "اُن کے درمیان سے" نہیں کہا گیا۔ پطرس حواری نے جہاں اس پیشینگوئی کو نقل کیا ہے وہاں بھی صرف "تمہارے بھائیوں میں سے" کہا گیا ہے۔ "تمہارے درمیان سے" نہیں کہا گیا

(ملاحظہ کتاب الاعمال باب ۳ آیت ۲۲) استفانوس نے بھی یہ پیشینگوئی اسی طرح نقل کی ہے، چنانچہ کتاب الاعمال کے باب ۷، آیت ۳۷ میں اس کا یہ قول مذکور ہے:-

یہ وہی موسیٰ ہے جس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے مجھ سا ایک نبی ظاہر کرے گا اس کی سنو۔"

ان تمام حوالوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کتاب استثناء، باب ۱۸ کی آیت ۱۵ میں "تیرے ہی درمیان سے" جو کہا گیا ہے اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ آنے والا نبی اولاد اسرائیل سے ہوگا۔ اہل کتاب کی عادت جاریہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بعید نہیں کہ آیت مذکورہ میں "تیرے ہی درمیان سے" کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا ہو۔

رہا دوسرا اعتراض تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا جو قول یوحنا نے نقل کیا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ "اس نے میرے حق میں لکھا ہے"۔ یہاں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ موسیٰ نے میرے حق میں فلاں موقع پر فلاں پیشینگوئی کی ہے۔ یہ مجمل بیان حضرت موسیٰ کی کسی خاص پیشینگوئی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس میں مطلقاً صرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مجھ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام میرے حق میں لکھ گئے ہیں۔ اس کو کس دلیل سے استثناء باب ۱۸ کی پیشینگوئی کے لیے خاص کیا جاتا ہے؟

دوسری بشارت

کتاب الاستثناء باب ۳۲ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے کس طرح خدا کی ناشکری کی، اور خدا نے جو انعامات ان پر کئے تھے ان سب کو بھلا دیا، اپنے خالق کو چھوڑ بیٹھے اجنبی معبودوں کی پرستش کی، شیطانوں کے لیے قربانیاں کیں خدا کے

مقابلے میں کج روی اور گردن کشی اختیار کی، یہاں تک کہ غیرت الٰہی جوش میں آگئی اور ان کے قابل نفرت کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا۔ پھر یہ سب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو ان سے نفرت کی اس لیے کہ اس کے بیٹوں اور اس کی بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں ان سے اپنا منہ چھپاؤں گا تاکہ میں دیکھوں کہ ان کا انجام کیا ہوگا اس لیے کہ وے کج نسل ہیں ایسے لڑکے جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہیں مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا۔ اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا" (آیت ۱۹ — ۲۱)۔

اس پیشینگوئی کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کے اعمال کی سزا یہ دی جائے گی کہ ان کو گرا کر ایک دوسری قوم کو اٹھایا جائیگا جس کی وجہ سے ان کی غیرت کو صدمہ پہنچے گا اور ان کی آتش حسد بھڑکے گی۔ یہ قوم جس کو بنی اسرائیل کے بعد اللہ تعالیٰ برگزیدہ کرنے والا تھا، اس کی دو علامتیں بیان کی گئی ہیں:—

پہلی علامت یہ ہے کہ وہ "گروہ نہیں"۔ عربی ترجموں میں غیر شعب اور لیس شعباً کے الفاظ سے اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں۔

I will move them to jealousy with those which are not a people ;

ان سب ترجموں کو ملا کر پڑھنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک منتشر و پراگندہ

قوم ہے جس پر"ایک قوم" کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ اقوام عالم میں وہ کسی شمار و قطار میں نہیں
دوسری علامت یہ ہے کہ وہ ایک "بے عقل" قوم ہے۔ عربی ترجموں میں شعب جاہل
اور امۃ غبیۃ کے الفاظ سے اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

I will provoke them to anger with a foolish nation

ان ترجموں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا
گیا تھا جو "جہالت" اور "ضلالت" کے معانی پر حاوی تھا۔

ان دو علامتوں کے سوا اشارۃ النص سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی قوم ہونی
چاہئے جس کو یہودی حقیر و ذلیل سمجھتے ہوں، تاکہ جب اپنے مقابلہ میں اس کو بڑھتے دیکھیں تو
ان کی غیرت کو سخت صدمہ پہنچے اور ان کی آتش حسد بری طرح بھڑکنے لگے۔

اب تاریخ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ زوال بنی اسرائیل کے بعد جتنی
قومیں ابھری ہیں ان میں سے بجز قوم عرب کے اور کسی پر یہ علامتیں راست نہیں آتیں۔ بابل،
یونان اور روم میں سے کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ صرف اہل عرب ہی تھے جن کو
قبائل اور بطون کی عصبیت نے اس قدر منتشر کر رکھا تھا کہ ان میں درحقیقت کوئی قومیت نہ
پائی جاتی تھی۔ (اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا) ان
کی جہالت و ضلالت بھی انتہائی حدود تک پہنچی ہوئی تھی (هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ
اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔) نیز چونکہ وہ لونڈی (حضرت حاجرہ) کی اولاد سے
تھے۔ اس لیے یہودی ان کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم ان میں مبعوث ہوئے تو یہودی مارے حسد کے جلے جاتے تھے اور ان میں سے

بہتوں نے آپ کی نبوت کو پہچان لینے کے باوجود اسلام لانے سے محض اس بنا پر اعتراض کیا کہ بنی اسماعیل کے نبی کو ماننا ان کو گوارا نہ تھا۔

تیسری بشارت

کتاب استثناء، باب ۳۳ میں ہے۔

"اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی۔ اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔ (آیت ۱-۲)

یہاں خداوند کا سینا سے آنا، حضرت موسیٰ کو تورات عطا کرنا ہے اور اس کا شعیر سے طلوع ہونا عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کرنا ہے اور اس کا فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہونا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنا ہے کیونکہ فاران کے متعلق تحقیق ہے کہ وہ مکہ کے پہاڑوں میں سے ہے عیسائی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو سینا کے مشرق میں واقع ہے۔ اس بحث کا تصفیہ جغرافی تحقیقات سے تعلق رکھتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں مصنفین اسلام ان کے اس دعوے کا ابطال پوری قوت کے ساتھ کر چکے ہیں، جو شخص اس باب میں اپنی تشفی چاہتا ہو وہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرے مگر ہم کہتے ہیں کہ خود اس آیت میں جو اشارات پائے جاتے ہیں وہ بھی عیسائی مصنفین کے دعوے کی تائید نہیں کرتے خدا کے آنے اور اس کے طلوع ہونے اور اس کے جلوہ گر ہونے کا مفہوم بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف سے علم و عرفان کی روشنی نازل ہو۔

بالفاظ دیگر اس سے مراد نزول وحی اور تنزیل کتاب اور اعطائے شریعت ہے۔ اب دیکھیے کہ اس اشراق ربانی کے تین مقام بتائے گئے ہیں۔ سینا، شعیر اور کوہ فاران۔ ان میں سے پہلا مقام بالاتفاق وہ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر سب سے پہلے نور خداوندی ظاہر ہوا۔ دوسرا مقام سلسلہ کوہ سعیر ہے۔ یہ جنوبی علاقہ جلیل (Galilee) کے عین سرے پر واقع ہے۔ جہاں مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور جہاں انہوں نے اپنی دعوت پھیلائی رہا تیسرا مقام تو اس کے لیے آیت زیر بحث میں جبل یا پہاڑی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عیسائی مصنفین زیادہ سے زیادہ اسی قدر دعوے کر سکے ہیں کہ جزیرہ نمائے سینا میں فاران ایک ریگستان ہے۔ کسی جبل فاران کا نشان انہوں نے اس ریگستان میں نہیں دیا۔ بخلاف اس کے مکہ کی پہاڑیوں میں جبل فاران ایک مشہور چیز ہے۔ نیز وہ یہ بھی نہیں بتا سکے کہ ان کے فاران مزعوم سے نور ربانی کا اشراق کب ہوا اور کس پر ہوا؟ وہ کون تھا جو وہاں دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا؟ اس ریگستان میں کس کے دہنے ہاتھ پر آتشی شریعت رکھی گئی؟ ان علامتوں پر انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ غور کیا جائیگا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کو ان کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ کیونکہ آپ ہی جبل فاران کے جوار میں پیدا ہوئے۔ پھر آپ ہی فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار قدسیوں کے ساتھ اس مقام پر جلوہ گر ہوئے اور آپ ہی کا ہاتھ تھا جو "آتشی شریعت" یعنی مجاہدانہ شریعت کا حامل ہوا۔

(باقی)

قرآنی نظریۂ سلطنت

اس کے مقدمات اور اس کی روح

از پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا استاذ جامعہ عثمانیہ

مترجمہ جناب مولوی سعید الحق صاحب ندوی بی۔ اے (علیگ)

پانچ سال سے زیادہ مدت گذری کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "علم السیاست کے میدان میں فکر مشرقی کا مقام" تھا، اس تصور سلطنت کے مطالعہ کی ابتدا کی جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے میں نے اس مضمون میں دوسرے مشرقی مفکرین کے ساتھ نظام الملک طوسی اور ابن خلدون کا بھی مختصر ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے الماوردی اور صاحب قابوس نامہ اور نظام الملک طوسی جیسے مختلف مصنفین کے افکار پر تنقیدی تبصرے کئے، جو رسالہ "اسلامک کلچر" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں مجھ کو اپنے رفقائے شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ کی معیت میں اسلامی فلسفۂ سیاست کی تاریخ کا ایک مفصل خاکہ بنانے کا موقع ملا، جو اس کے آغاز عہد سے لیکر موجودہ لامرکزی رجحانات کے زمانہ تک کی پوری تاریخ پر حاوی ہے۔ یہ خاکہ ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے بنایا گیا ہے جو تاریخ سیاسیات اسلامی پر اس عظیم الشان تالیف کا کام اپنے ہاتھ میں لیں گے جسے طیار کرنے کا حکم جامعہ عثمانیہ نے دیا ہے۔

موضوع کی اہمیت | جب انسان اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع مباحث کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ان سیدھی سادھی صداقتوں کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے جن سے سیاسیات کا

ایک زبردست دریا پھوٹ نکلا، قرنوں اور صدیوں کے دوران میں دشت وجبل اور نشیب و فراز سے گذرتا اور ہزار ہا شکلوں میں ڈھلتا رہا، مگر اپنی ظاہری صورت میں زمین کے جغرافی یا عارضی تشکلات کے مطابق بدلتے رہنے کے باوجود اس کی جوہری خصوصیات وہی کی وہی رہیں جو پہلے تھیں۔ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے، یہ احساس اتنا ہی زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ اِدھر اُدھر سے مختلف مصنفین کے خیالات کو جمع کر لینا لاحاصل ہے، جب تک کہ سب سے پہلے ان کے اصل مبادی کا سراغ نہ لگایا جائے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اول تو جب موضوع بحث ایک ایسی سوسائٹی ہو جیسی کہ قدیم عربوں کی تھی اور ایک ایسی کتاب ہو جیسا کہ قرآن ہے، تو سیاسی تصورات کو ان دوسرے تصورات سے جدا کرنا بہت مشکل ہے جنہوں نے ایک وقت میں عرب کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا کیونکہ سیاسی اور غیر سیاسی عوامل کی یہ نازک امتیازات تو بہرحال جدید زمانہ ہی کی پیداوار ہیں۔ صدیوں پہلے جو لوگ دنیا میں بستے تھے وہ ان سے آشنا نہ تھے۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ضبط اور تنظیم جو امکانی آزادی حاصل کرنے کے واحد ذرائع ہیں اور جن کو عام محاورہ میں "سیاست" کہا جاتا ہے، اگرچہ ایک سوسائٹی کی فلاح و بہبود میں ان کا بہت کچھ دخل ہے، مگر پھر بھی ایک قوم کی زندگی کے دوسرے عوامل سے قطع نظر کر کے صرف یہی دو چیزیں پورے پس منظر پر حاوی ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں، اور جو تصویر اس طور سے بنے گی وہ غیر حقیقی و نامکمل ہو گی۔ بہرحال جہاں تک قرآن مجید کے سیاسی پہلو کا تعلق ہے ایسے علم کی حد تک اس کو نمایاں کرنے کی اب تک کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں ہم قرآن مجید کے اسی سیاسی پہلو کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے مگر چونکہ وقت کم ہے اس لیے ہم معلومات کے اس بڑے ماخذ کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں گے۔ جو حدیث کے ذخیرہ میں موجود ہے۔

مقدمات بغیر اس کے کہ قرآنی سلطنت اور ان سیاسی نظاموں کے درمیان جو رسالت محمدی صلعم کے زمانہ میں جزیرۃ العرب کے اطراف میں قائم تھے، کوئی ربط تجویز کرنے کی کوشش کی جائے اگر ہم ان کے متعلق بھی کچھ واقفیت بہم پہنچالیں، اور اس کے ساتھ عربوں کے بھی ان سیاسی حالات پر ایک نظر ڈال لیں جو چھٹی صدی کے اختتام اور اس کے قریبی زمانہ میں تھے، تو یہ توضیح بیان کے لیے مفید ہوگا۔

اس زمانہ میں عرب کی شمالی سرحد پر دو طاقتور سلطنتیں تھیں، یعنی ایران اور Nova Roma یعنی بازنطیم۔ ایران نے مغربی اور وسطی ایشیا کی تہذیب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور مشرقی رومن امپائر قدیم یونان و روما کی بلا واسطہ جانشین تھی۔ ان دونوں بڑی سلطنتوں کے نظم اور ان کے ساتھ ساتھ قدیم عرب کے سیاسی حالات کے متعلق کچھ واقفیت بہم پہنچا لینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اور یہی واقفیت ہم کو مماثلات اور مباینات کے سمجھنے میں مدد دے گی، جن کی تمیز کسی دوسرے ذریعہ سے ہونی مشکل ہے۔

ایران ایران اپنی ایک مربوط تاریخ رکھتا ہے جو یونان اور روم کی معلوم تاریخ سے سینکڑوں برس پہلے شروع ہوتی ہے، اور ابتدا ہی سے اس میں ایسی زبردست وحدت اور مرکزیت کی مثال ملتی ہے جس کا حاصل ہونا ایسے قدیم زمانہ میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایران کی صرف اسی حالت سے بحث کرنا کافی ہوگا جو چھٹی صدی عیسوی کے آخر زمانہ میں تھی، یعنی خسرو انوشیروان کے دور میں تمام قدیم آریہ قوموں کی طرح ایرانی بھی چار طبقوں میں منقسم تھے جن کے درمیان قطعی اور واضح امتیاز پایا جاتا تھا۔ ان میں سے تین اونچے طبقے اسبے فرد تر چوتھے طبقے سے بالکل الگ تھے۔ اونچی ذات کے تین طبقے یہ تھے:۔

۱۔ مذہبی پیشوا اور قضاۃ۔ یہ صرف قبیلہ مجی سے لئے جاتے تھے، اس لیے ان کو

مجی پت یا موبد کہا جاتا تھا۔

۲۔ اہل سیف۔

۳۔ اہل قلم یا عمال حکومت۔

چوتھا طبقہ اہل حرفہ اور مزارعین پر مشتمل تھا۔

شاہنشاہ کی ذات سیاسی وحدت اور نظم کا خارجی مظہر تھی، اور اس کو شاہنشاہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف صوبہ داروں کا حاکم اعلیٰ تھا، بلکہ ان بادشاہوں پر بھی اقتدار رکھتا تھا جو سلطنت کے دور دراز علاقوں پر فرمانروا تھے، مثلاً عراق عرب میں حیرہ کا بادشاہ۔ امرا کے سب سے اونچے طبقے میں جن کا شمار ہوتا تھا وہ مرزبان اور پہلوی تھے۔ یہ لوگ ایران اسپہبد (سپہ سالار اعظم) اور اسپہپد (سپہ سالار) کے عہدوں پر سرفراز ہوتے تھے، بڑی بڑی جاگیریں ان کو ملتی تھیں جن کے محاصل تمام تر ان کی جیبوں میں جاتے اور کوئی خاص فرض ان سے متعلق نہ تھا۔ یہ تو خاندانی امرا تھے۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ سرکاری امرا کا بھی تھا اور وہ بھی ملک کو لوٹنے میں کچھ کم نہ تھا۔ عام باشندے یا تو آزاد شہری تھے یا غلام کاشتکار جنھیں کسی انعام یا معاوضہ کے بغیر مزارع یا لشکروں میں خدمت بجا لانی پڑتی تھی۔ یہ لوگ بالکل منقطع تھے اور دہقانوں یا زمینداروں کے مرتبہ تک بھی پہنچنے کی امید نہ کرسکتے تھے، کیونکہ ان کو ناقابل عبور امتیازات نے دہقانوں سے جدا کر دیا تھا اور دہقان صرف ان کی محنتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ دہقانوں سے اوپر پدگوش بن یعنی زامرائے ہوتے تھے جو سلطنت کے چار بڑے اقطاع کے دیوانی اور فوجی زمام دار تھے۔ مقدسین کے اس پورے گروہ سے بالاتر شاہی مجلس وزرا تھی جو ہزارپت (وزیر اعظم) موبدان موبد (راج گرو) ہربد (آتش کدہ

لہ ان کی حیثیت سلطنت مغلیہ کے منصبداروں کی سی تھی جو موجودہ زمانہ میں حیدرآباد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

کا محافظ) دبیر بد (میر منشی) اور اصلی پہبد (سپہ سالار) پر مشتمل تھی۔

شاہنشاہ تمام نظم حکومت کا مرکز تھا۔ وہ بیک وقت قوم کا ظہور مجسم بھی تھا، مدار حکومت بھی تھا اور وہ منبع بھی تھا جس سے تمام عزتوں اور حرمتوں کے چشمے نکلتے تھے شاذ و نادر کسی موقع پر وہ عوام کو اپنے درشن دکھاتا تھا، اور جب کبھی ایسا ہوتا تو بڑے جشن اور شان و شوکت کے ساتھ ہوتا۔ ملبوسات فاخرہ زیب تن ہوتے، نہایت بھاری تاج (ایک طلائی زنجیر کے ساتھ چھت میں لٹکا ہوا ہوتا۔ سونے کے تخت پر شاہنشاہ جلوہ گر ہوتا۔ خانوادہ شاہی کے شاہزادے ایک بڑے مطلّا و مذہب سراپردے کو تھام کر کھڑے ہوتے اور پردہ اس وقت تک پڑا رہتا جب تک کہ حاضرین کی خوش قسمتی سے وہ وقت نہ آجاتا جو شہنشاہ کے دیدار سے ان کو سرفراز کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔

قدیم جماعتوں میں ارادی وضع قانون کا فقدان تھا۔ ایران بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تاہم جو تھوڑی بہت قانون سازی بھی ہوی، اس کے لیے موبدوں کی جماعت سے منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ لوگ پرانے مزدی مذہب کے حاملان شریعت تھے اور قدیم مجی قبیلہ سے لیے جاتے تھے تعلیم کی خدمت بھی ان سے بلکہ شاید انہی سے متعلق تھی، اور یہی ان لوگوں پر جرمانے کرتے تھے جو خلاف ورزی قانون کے مرتکب ہوتے تھے۔ دین سے انحراف اور بغاوت کی سزا موت تھی اور بسا اوقات آنکھیں نکالنے، سولی پر چڑھانے، سنگسار کرنے اور بھوکا مار دینے کے طریقے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ جب مسیحیت کا ظہور ہوا، تو صلیب کے پرستاروں کو خاص طور پر سلطنت کے غضب و انتقام کا ہدف بنا لیا گیا۔ چونکہ یہ لوگ ایران کی ہمسایہ اور دشمن سلطنت، باز نطیم کے ساتھ قریبی علاقہ رکھتے تھے اس لیے ان کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیا جاتا تھا۔

ایرانی محاصل دوسری بڑی سلطنت یعنی بائزنطیم کے نظم ونسق کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ان محاصل کے متعلق بھی کچھ کہنا مناسب ہوگا جو قریب کے جزیرہ نما میں اسلام کے رونما ہونے سے پہلے ایران میں وصول کیے جاتے تھے، کیونکہ ان کا عکس دور خلافت میں نظر آتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم زمین کا محصول تھا جس کا نام "خراج" ہے۔ یہ زمین کی پیمائش اور پیداوار کے لحاظ سے ہر پرگنہ پر بحیثیت مجموعی عائد کیا جاتا، اور پھر عائد کردہ مقدار خراج کو پرگنہ کی آبادی پر مساویانہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خراج کی مقدار کل پیداوار کا ⅓ سے ⅙ تک حصہ ہوتی تھی۔ دوسرا اہم محصول کزیت (عربی، جزیہ) تھا۔ یہ ایک مقررہ سالانہ محصول تھا جو باشندوں سے اس طرح وصول کیا جاتا تھا کہ جو جتنا زیادہ مالدار ہو وہ اتنا ہی زیادہ دے، اور اس کا بار زیادہ تر ان لوگوں پر عائد ہوتا تھا۔ جو اراضی کے مالک نہ تھے یا نہ ہو سکتے تھے، مثلاً یہودی عیسائی اور دوسرے باشندے جن کی عمر ۲۰، اور ۵۰ برس کے درمیان ہو۔ ان دو بڑے محاصل کے علاوہ بادشاہ کی خدمت میں نذریں پیش کرنے کا بھی دستور تھا، خصوصاً ہر سال اعتدال ربیع وخریفی کے تہواروں کے موقع پر۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش (۵۷۰ء) سے پہلے ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں کے تخت پر دو ایسے فرمانروا متمکن تھے جنہوں نے تاریخ میں نمایاں جگہ پائی ہے یعنی ایران میں خسرو انوشیروان اور بائزنطیم یا قسطنطنیہ میں جسٹنین (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) اب ہم موخر الذکر سلطنت کے نظم ونسق پر ایک نظر ڈالیں گے جس کے مقبوضات تھوڑے ہی عرصہ بعد اسلامی سلطنت کے علمبرداروں کی زد میں آگئے۔

مشرقی سلطنت روما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پانچ ہی سال قبل جسٹنین ۳۸ سال کی فرمانروائی کے بعد وفات پا چکا تھا۔ آنحضرت صلعم کی بعثت سے قبل ۴۰ سال

کی مدت میں قسطنطنیہ کے تخت پر چار فرمانروا متمکن ہوئے جسٹن ثانی (۵۶۵ء تا ۵۷۸ء) ٹبریس ثانی (۵۷۸ء تا ۵۸۲ء) ماریس (۵۸۲ء تا ۶۰۲ء) فوکس (۶۰۲ء تا ۶۱۰ء) ان کے بعد ہرقل تخت نشین ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے پورے زمانہ میں وہی حکمران رہا۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ قسطنطنیہ کی دستوری تاریخ کا وہی حصہ یہاں پیش کیا جائے جو اس واقعات سے لبریز دور میں گذرا ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ وہ سب کچھ جو درحقیقت رومن تھا، اسے خود اسی فرقہ نے برباد کیا جو اپنے آپ کو رومن کہلانا پسند کرتا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطنت کا نظم و نسق جمہور یا ان کی سینٹ کے ہاتھ میں رہتا وہ اب تمام تر ایک ممتاز طبقہ پر مشتمل ہو گیا جو بالکل فرمانروا کی مرضی کا تابع اور جمہور سے کلیتہً الگ تھا۔ خود باشندے بھی چند طبقوں میں منقسم ہو گئے تھے۔

۱۔ اہل زمین (Curule caste) جو مالکان اراضی تھے اور وہ کبھی سپاہی یا تاجر نہیں بن سکتے تھے۔

۲۔ اہل حرفہ جو ایران کے ایسے ہی طبقہ کی طرح ان آزاد باشندوں پر مشتمل تھے جو زمین کے مالک نہ تھے۔ اور جزیہ کی طرح کا ایک ٹیکس ان سے لیا جاتا تھا مختلف پیشہ ور گروہ ان میں شامل تھے اور ہر گروہ کی رکنیت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی۔

۳۔ اہل سیف۔

مگر یہ تمام طبقات اس جابرانہ تحصیل پالیسی کے شکار ہو گئے تھے جو اس سلطنت کے لیے آخرکار ایک بلائے عظیم ثابت ہوئی۔ ایک مصنف جس نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ لکھتا ہے کہ کاشتکاروں کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ شاہی دربار اور لشکر کو خورش و پوشش بہم پہونچانے کے آلات تھے۔ قیاصرہ صرف جائز محاصل ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ اکثر نذرانے

اور پیش کش بھی وصول کرتے رہتے تھے، جو ابتدا میں تو اختیاری تھے مگر بعد میں ان کو ایک مستقل ذریعہ آمدنی بنا لیا گیا تھا۔

بازنطینی طرز حکومت جہاں تک حکومت کے واقعی نظم و نسق کا تعلق ہے، وہ گویا قیصر کا ایک خانگی معاملہ بن گیا تھا۔ اگرچہ ایک مدت تک سینٹ برائے نام باقی رہنے دی گئی تھی، اور اس کی زندگی کا قطعی خاتمہ جسٹنین کے عہد سے پہلے نہ ہوا تھا، لیکن جب وہ قائم تھی اس زمانہ میں بھی اس کا عدم و وجود برابر تھا سا تھا۔ آخر کار جسٹنین نے اپنی صحیح بربری اصلیت سے کام لے کر قدیم سیاسی نظام کا نام و نشان تک مٹا دیا اور حکومت کی تنظیم اس طور پر کی کہ دربار کی زینت کے لیے ہر چیز کو جرمانہ اور تاوان بنایا جا سکتا تھا۔ جائے تعجب ہے کہ جو شخص قدیم رومی قانون کے مدوّن کی حیثیت سے اتنا مشہور رہے اس کا نامۂ اعمال کس قدر سیاہ کاریوں سے لبریز ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم یورپ کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی جمہور پر اس قدر مصائب نازل نہیں ہوئے جتنے اس "مقنن" کے دور میں ہوئے ہیں۔ آزاد شہریوں کو پکڑ پکڑ کر فروخت کیا جاتا تھا۔ لوگ ٹیکسوں سے بچنے کے لیے اپنے تاکستانوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتے اور عمارتیں مسمار کر دیتے تھے۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے کہ جس علاقہ کے محاصل وصول نہ ہو سکتے وہاں کے دولتمند باشندوں کی املاک ضبط کر لی جاتیں حتیٰ کہ ان کو بالکل قلاش کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ جسٹنین اعظم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کے زمانہ میں سرکاری عہدے علانیہ فروخت کیے جاتے تھے۔ اور احکام جاری کیے گئے تھے کہ قیمت یا تو خود بادشاہ کو ادا کی جائے یا اس کی بیگم، ملکہ تھیوڈورا کو۔

مذہبی تعصب مذہبی معاملات میں کوئی روا داری نہ تھی۔ جب تک مسیحیت قبول نہ کی گئی تھی مسیحیوں پر ظلم کیا جاتا تھا، جب بادشاہ نے یہی مذہب اختیار کر لیا، تو علوم مدرسی، اور دین یہود اور

ہر اس چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی، جو بادشاہ کے مذہب سے انحراف کا ادنیٰ شائبہ بھی رکھتی ہو۔ ۵۲۹ء میں جسٹنین نے علوم بلاغت اور فلسفہ کے مدارس کو قطعی طور پر بند کر دیا ان کے جتنے اوقاف تھے سب ضبط کر لیے۔ اور فلاطون کی اکاڈیمی، ارسطو کے بیت الحکمۃ اور زینو کی درسگاہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ تھیوڈوسیس (۳۷۸ء سے ۳۹۵ء) جس کے نام کے ساتھ "اعظم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس سے پہلے ہی ان الیمپن کھیلوں Olympian games کو موقوف کر چکا تھا جو ہزار سال سے جاری تھے۔ اس کے زمانہ میں ایتھنز کو اس حد تک فکری غلامی میں مبتلا کر دیا گیا تھا کہ بجز ان خیالات کے جن کی تصریح عمال شاہی کے عطا کردہ اجازت نامہ میں کر دی جاتی تھی، کسی دوسرے خیال کی تعلیم دینا ممنوع تھا۔ مشرقی سلطنت میں مذہبی جبر و ظلم کا جو حال تھا اس کی مثال میں ہم ایک رومی امیر فوکس (Phocas) کا واقعہ پیش کر سکتے ہیں جس نے بجبر عیسائی بنائے جانے سے بچنے کے لیے زہر کھا لیا۔ اس کے چند ہی سال بعد اسی نام کے دوسرے فوکس نے جو قیصر تھا تمام سلطنت کے یہودیوں کو بجبر عیسائی بنا لینے کا حکم دیا۔ اس کا جانشین اگرچہ اس کا ایسا دشمن نکلا کہ اس نے فوکس کو قتل کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے، مگر یہ دشمن کا دشمن بھی یہودیوں کے حق میں دوست ثابت نہ ہوا۔ اس نے ان کو بیت المقدس سے نکال باہر کیا اور حکم دیا کہ یہ لوگ اس مقدس شہر سے تین تین ہزار فیٹ تک کی حد میں قدم نہ رکھنے پائیں۔ سلطنت کی اخلاقی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ قیصر ہرقل کی شادی خود اس کی اپنی بھتیجی سے ہوئی اور نکاح پڑھانے والے کوئی اور بزرگ نہیں، خود قسطنطنیہ کے اسقف اعظم تھے۔

یہ حال تھا ایران اور مشرقی روم کی سیاست کا چھٹی صدی عیسوی کے آخری زمانہ میں اور ہم اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتے کہ مشرق اوسط کے ایک بڑے مورخ (Finley

کی عبارت نقل کر دوں جو خود یونانی روایات کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ وہ حالات کا خلاصہ اس طرح بیان کرتا ہے :۔

"شائد تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جس میں سوسائٹی کا اخلاقی انحطاط اس قدر عالمگیر ہو، اور جس میں تمام وہ قومیں جن سے رومی اور یونانی واقف تھے قوت عمل اور نیکی سے اس درجہ عاری ہو گئی ہوں، جیسا کہ جسٹینن کی وفات سے محمدؐ کے ظہور تک کا دور گذرا ہے۔

تلافی مافات کا وقت آنا ضرور تھا۔ ایسے واقعات نے جنہیں کوئی انسانی فراست پہلے سے نہ دیکھ سکتی تھی، جن کے خلاف کوئی انسانی حکمت نہ لڑ سکتی تھی، جن کی توجیہ میں ایک فلسفی بجز اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ ان کو تقدیر الٰہی اور قسمت ایزدی کی طرف منسوب کر دے جس کا نمایاں اثر پوری انسانی تاریخ میں نظر آتا ہے، آخر کار مشرق کے بہت سے علاقوں میں رومی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔"

عربی ریاستیں اب ہم سرزمین عرب کی طرف آتے ہیں جو دین اسلام کا گہوارا بننے والی تھی ہم دیکھیں گے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی پیدائش اور بعثت کے وقت اس سرزمین کی سیاسی حالت کیا تھی۔

عرب اپنے آپ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں :۔

۱۔ عرب البائدہ، یعنی شمال کی حامی آبادیاں۔

۲۔ عرب العاربہ، یعنی وہ سامی النسل لوگ جو قحطان یا یقطان کی اولاد سے تھے اور جنہوں نے بہت قدیم زمانہ میں عرب العاربہ پر تسلط جما لیا تھا۔

۳۔ عرب المستعربہ، یعنی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد جو ابتدائً شمال سے آئی اور عرب العاربہ کے درمیان رہ بس گئی۔

عرب البائدہ کا وجود ایک مستقل جمعیت کی حیثیت سے بہت پہلے ہی فنا ہو چکا تھا، اور جزیرۃ العرب باقی ماندہ دونوں گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ قحطانیوں کا وطن جنوب میں یمن کا علاقہ تھا، اور ابراہیمی جیسا کہ اوپر بیان ہوا شمال سے آئے تھے۔ قحطانی جنوب سے شمال کی طرف چلے اور حجاز، یمامہ اور یثرب میں پھیل گئے۔ پھر وہ شمال کی طرف اور آگے بڑھ کر شام تک پہنچے جہاں انہوں نے مسیحی دور کے آغاز میں دمشق کے قریب غسان کی ریاست قائم کی۔ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہ ریاست مشرقی سلطنت روما کے زیر اثر آگئی، اس کا بادشاہ عیسائی ہو گیا، اور خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک اس کا وجود برقرار رہا۔ قحطانیوں کی ایک اور شاخ شمال مشرق کی طرف گئی جہاں اس نے ۱۹۵ء کے قریب زمانے میں بابل قدیم سے متصل فرات کے کناروں پر حیرہ کی ریاست قائم کی۔ غسان کی طرح یہ ریاست بھی زیادہ مدت تک آزاد نہ رہ سکی اور اس پر ایران کی سیادت قائم ہو گئی تاریخ میں ہم کو حیرہ کے ایک بادشاہ منذر کا یہ حال ملتا ہے کہ شاہنشاہ ایران نے اس کو "ہشت" (اعظم) کا خطاب عطا کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چالیس سال قبل نعمان بن منذر نے ایرانی سیادت سے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار ۶۱۱ء میں خسرو پرویز نے حیرہ کی ریاست کو سلطنت ایران میں ضم کر لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ حیرہ اور غسان کی یہ چھوٹی چھوٹی امارتیں اس قدر حقیر اور مغلوب تھیں کہ ملک عرب کے نظم ونسق کی تاریخ میں ان کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ مشرقی وسط عرب بھی کچھ بہتر حال میں نہ تھا، کیونکہ وہاں کے یمنی زمام دار بھی ایرانی سیادت کے تابع تھے۔ اگرچہ ایرانی تہذیب کے مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کو نسبتاً کچھ زیادہ استقلال میسر تھا۔ جنوب میں قحطانیوں کا وطن اصلی، اپنے ہمسایہ یعنی حبش کے نجاشی (Negus

سے آزادی کی جنگ میں مبتلا تھا اس جھگڑے کی ابتدا اس مذہبی عداوت سے ہوئی جو ۵۲۹ء کے قریب زمانے میں یمن کے یہودی فرمانروا یوسف ذونواس اور حبشی عیسائیوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں فریقوں کے درمیان قسمت کے پلڑے اٹھتے اور جھکتے رہے حبشیوں نے رومی امداد سے یمن پر قبضہ کر لیا۔ ایران نے یمنی فرمانروا سیف بن ذی یزن حمیری کی مدد کی اور اس نے حبشیوں کو نکال باہر کیا سیف کے بعد اس کا بیٹا معدی کرب ایرانیوں کی مدد سے تخت نشین ہوا، اور یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مختلف عربی علاقوں سے جو سفرا اس کو مبارکباد دینے کے لیے گئے ان میں جمہوریۂ مکہ کے سفیر عبدالمطلب بھی تھے۔ یہ پیغمبر اسلام کے دادا ہیں۔

قبائلی نظام قبل اس کے کہ ہم عرب کے ان باقی ماندہ علاقوں کی سیاسی حالت بیان کریں جو عنقریب تمام دنیا کے نہیں تو کم از کم جزیرہ نمائے عرب کے مرکز بننے والے تھے، مناسب ہوگا کہ عربی قبائل کی سیاسی زندگی کے چند خصائص پر نظر ڈال لی جائے۔ سامی قبائل میں عموماً اور عربوں میں خصوصاً ایک غیر معلوم زمانے سے انفرادیت کا نہایت شدید جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اُن کی نگاہ میں خاندان نہیں بلکہ فرد اور قبیلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ عربی معاشرت کی ساخت خونی رشتوں پر قائم تھی۔ قدیم یونانیوں کی طرح ہر خاندان کا ایک الگ خدا تھا اور ہر عرب قبیلہ کے افراد ایک مشترک معبود کی عبادت کے رشتہ سے باہم مربوط ہوتے تھے ان کے ہاں احساس قومیت کے بجائے تمام تر اہمیت صرف نسب نامہ کی تھی۔ ہر قبیلہ اپنا ایک خاندانی لقب، ایک مشترک مورث اعلیٰ رکھتا تھا جس سے تمام افراد خاندان مرد اور عورت اپنا سلسلہ نسب ملاتے تھے۔ یہ سوسائٹی ”آبائی“ Patriarchal کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس میں سلسلۂ نسب صرف مرد سے چلتا ہے قبیلہ کا سردار شیخ کہلاتا تھا۔ مگر ہم کو یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ یہ شیخ دراصل کوئی موروثی عہدہ دار

نہ تھا بلکہ اپنے پیش رو کی وفات کے بعد اس کا انتخاب ہوتا تھا، البتہ مرور ایام کے ساتھ اس اعزاز میں بھی موروثیت کا رنگ آجایا کرتا تھا۔ وہ کسی حیثیت سے بھی رومی بزرگ خاندان (Paterfamilias) کے مشابہ نہ تھا۔ اور نہ اس کے اختیارات وہ تھے جو رومی ابوالعائلہ (Patria potestas) کے تھے وہ محض ایک ثالث بالخیر یا حکم تھا جس کا کام صلح کرانا ہوتا تھا۔ وہ منازعین کے درمیان صلح کی بات چیت کرتا اور جس کی زیادتی ہوتی اس پر اپنا اخلاقی اثر استعمال کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر بہت زیادہ تھا، مگر اقتدار اعلیٰ اس کو حاصل نہ تھا۔ ایک معین ضابطۂ قانون نہ ہونے کی وجہ سے افراد کے ظن وتخمین کے لیے بہت گنجائش تھی قبائل کے درمیان جو کچھ بھی سیاسی تعلقات تھے ان کا تمام تر انحصار محض فریقین کے اخلاقی احساس پر تھا۔ اور چونکہ عربوں میں خودداری اور عزت نفس کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا، اس لیے قبائل کے درمیان مناقشات کا ایک غیر مختتم سلسلہ چلتا تھا۔ یونانیوں کی طرح عربوں کے ہاں بھی بڑے بڑے میلے لگتے تھے جن میں اطراف واکناف ملک سے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ مثلاً دومتہ الجندل کے، حجر، عمان، حضرموت اور صنعاء کے میلے۔ مگر وحدت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے ان سے عربوں کے مختلف گروہوں میں مزید سیاسی اختلافات کی بنا پڑتی تھی۔

یہ امر معنی خیز ہے کہ اوپر جن ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے تو کوئی بھی خود مختار نہ تھی۔ کسی پر رومی اقتدار قائم تھا۔ کوئی ایران کے اثر میں تھی، اور کوئی حبش کے اثر میں۔ مگر عرب کی فطری خود مختاری کی شان ان مختلف عربی قبائل میں نظر آتی ہے جو زیادہ تر مغربی عرب میں رہتے تھے۔ ان حالات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے تاکہ ان سے اندازہ کیا جاسکے کہ ایسی سوسائٹی میں انفرادیت کو دبا کر ایک مستحکم ضابطۂ آئین وقانون

قائم کرنا کس درجہ محنت طلب کام تھا۔

مکہ کا سیاسی نظام اب ہم خاص طور پر مکہ کی حالت بیان کریں گے جو پیغمبر اسلام کا مولد، اور بعد میں دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا تھا۔ مکہ تیسری صدی عیسوی تک یمن کے خاندان بنی جرہم کے قبضہ میں تھا۔ ان کے بعد ایک قحطانی خاندان، بنی خزاعہ نے مکہ اور جنوبی حجاز پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ پھر قُصَی بن کلاب نے اس کو نکال باہر کیا۔ یہ قُصَی، فہر کی ساتویں پشت میں تھا، اور فہر وہ شخص ہے جس کا لقب قریش تھا اور جس سے مشہور خاندان قریش کی بنا پڑی۔ قصی نے مکہ کا انتظام بڑے سائنٹفک انداز میں کیا۔ اس نے حکومت کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا تھا:۔

۱۔ دارالندوہ، جس میں ندوہ یعنے سینٹ کا اجلاس ہوتا تھا۔ حکمران خاندان کے افراد اور شہریوں میں سے وہ لوگ اس مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے تھے جن کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہوتی۔

۲۔ لواء، یعنی حکمران کی فوجی طاقت کا نشان جو لڑائی کے موقع پر سالار فوج کو دیا جاتا تھا۔

۳۔ رفادہ، غربا کی امداد کا ایک محصول جو زیادہ تر منیٰ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر غریب حاجیوں کو کھانا کھلانے کے لیے وصول کیا جاتا تھا۔

۴۔ سقایہ، آبرسانی کا انتظام جو اہل عرب کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۵۔ حجابہ، یعنی کعبہ کی کلید برداری، جو اس قدیم معبد کی حفاظت اور پوجا پاٹ کے انتظام پر مشتمل تھی۔

۴۸۰ء کے قریب زمانہ میں جب قصی کا انتقال ہوا تو اس کی اولاد میں ان اہم

عہدوں کی تقسیم کے لیے کشمکش شروع ہوی، اور پھر یہ عہدے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں حکومت کے شعبوں کی ازسرنو تقسیم ہوی اور ان کو کعب کی اولاد میں بانٹ دیا گیا جو قریش کی چوتھی پشت میں گذرا ہے۔ اس جدید تقسیم کا بیان بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ان عہدہ داروں میں سے بعض کے نام اسلامی تاریخ میں بھی بڑے حرفوں سے لکھے ہوئے ملتے ہیں:-

۱۔ بنی عدی میں سے عمر بن الخطاب کو سفارت کا عہدہ دیا گیا۔ دوسرے قبائل اور ریاستوں کے ساتھ معاملات میں قریش کی نیابت کرنا ان کا کام تھا۔

۲۔ بنی حصیص میں سے حارث بن قیس کو خزینہ یعنی فینانس اور پبلک ٹرژری کی نظارت دی گئی۔

بقیہ آٹھ عہدے کعب کے دوسرے بیٹے مرہ کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیے گئے:-

۳۔ قُبّہ جو فوجی کیمپ کے نظم اور جنگ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنے سے متعلق تھا۔ یہ عہدہ خالد بن ولید کو دیا گیا۔

۴۔ دیت، یعنی خونبہا، جرمانے اور مالی تاوان کا انتظام۔ یہ عبداللہ بن عثمان سے متعلق تھا جو بعد میں ابو بکر کے نام سے مشہور ہوئے۔

بقیہ تمام عہدے قصی کی اولاد کو دیے گئے جو مرہ کا پوتا تھا اور جس نے مکہ کو بنوخزاعہ سے آزادی دلوائی تھی۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

۵۔ اس کے پوتے اسد بن عبد العزی کو ندوہ کا صدر بنایا گیا۔

۶۔ عثمان بن طلحہ کو حجابت دی گئی۔ اس طرح وہ کلید بردار کعبہ ہو گئے۔

۷۔ عباس بن عبد المطلب سقایہ پر مقرر کیے گئے۔

۸۔ حارث بن عامر کے سپرد رفادہ کی خدمت کی گئی۔ یہ بنی نوفل میں سے تھے۔

۹۔ لوار کی خدمت جو در اصل قریش کی سپہ سالاری تھی، ابوسفیان کو دی گئی جو بنو امیہ میں سے تھا۔

۱۰۔ ازلام یا ایسار یعنی بتوں سے استخارہ کرنے کی خدمت صفوان کے سپرد کی گئی جو بنو جمح میں سے تھا۔

یہ ایک مقرر قاعدہ تھا کہ ان دسوں سرداروں میں جو سب سے زیادہ معمر ہو اس کو رئیس کہا جائے۔ مگر عبد المطلب کی وفات کے بعد درحقیقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو باقی سب لوگوں پر فوقیت رکھتا ہو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو عنقریب انسانی افکار میں انقلاب عظیم برپا کرنے والے تھے عبداللہ بن عبد المطلب کے ہاں ان کی زوجۂ محترمہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف کے بطن سے، اُس مشہور حملہ کے چند ہفتوں بعد پیدا ہوئے جو یمن کے عیسائی فرمانروا ابرہۃ الاشرم نے مکہ پر کیا تھا۔ آپ کے والد، والدہ اور دادا کی وفات نے بچپن ہی میں آپ کو ان تینوں سے محروم کر دیا جو آپ کی دنیوی محافظ و مربی ہو سکتی تھیں۔ عبد المطلب کی وفات کے بعد مکہ کے سیاسی معاملات بہت خراب ہو گئے۔ بنی کعب کے مختلف خاندانوں کی باہمی رقابت کے سبب سے سرداران قریش میں مسلسل جھگڑے برپا ہونے لگے۔ مکہ کے بازاروں میں آئے دن سخت فتنہ و فساد کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے، اور مرور ایام کے ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سرداران قریش کے درمیان کسی طرح مفاہمت ہی ہونے میں نہ آتی تھی، یہاں تک کہ آخر کار عبد المطلب ہی کے پوتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ان کے درمیان ایک ایسی مصالحت کرا دی جس سے لوگوں کی املاک اور جانیں محفوظ ہو گئیں۔ یہ مفاہمت

حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے، جو ۵۹۵ء میں ہوئی اور اس کے ذریعہ سے اہل مکہ کو ظالموں کے دست تطاول سے بچانے کے لیے ایک جتھا قائم کرلیا گیا۔ اس کے چند سال بعد ہم دوبارہ سنتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بازنطینیوں کی ایک سازش کا خاتمہ کیا جس کا مقصد مکہ پر قبضہ کرنا تھا، اور جس کے لیے ایک عرب عثمان بن حویرث کو رشوت دی گئی تھی۔ آخری قابل ذکر واقعہ تعمیر کعبہ کا ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی دوراندیشی اور فراست اور حسن تدبیر کا کیا حال تھا اور آپ نے کس طرح مکہ کی سوسائٹی کا شیرازہ بندھا رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس موقع پر ایک فتنۂ عظیم جو بھڑکنے کے لیے بالکل تیار تھا آپ ہی کی تدبیر سے فرو ہوا۔ یہ واقعات نزول قرآن سے پہلے کے ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی فراست، تدبر، قوت فیصلہ اور پر اثر شخصیت کس طرح نمایاں ہوچکی تھی۔ (باقی)

بچوں کیلئے مفید کتابیں

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز بیان کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق، دین داری، حسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت ۶ر حالی ۶ر کلدار علاوہ محصول ڈاک

مسلمان بی بیاں یہ کتاب "ہمارے نبی کے صحابہ" کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان مقدس ہستیوں کی دین داری حسن اخلاق اور خانگی زندگی میں ان کے نیک برتاؤ کے واقعات بیان کئے گئے ہیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب شمع ہدایت ہے اور بہت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے قیمت ۶ر حالی ۶ر کلدار علاوہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

تنزیل و تاویل

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

(۲)

از جناب مولانا طاہر بن احمد صاحب (دار العلوم دیوبند)

۱۳- اور یہ تو ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ انسان کی حفاظت کے لیے ملائکہ کی بے شمار جماعتیں مقرر ہیں جو ملکیت و بہیمیت کے ہر اسٹیشن پر اپنی چھاؤنی ڈالے ہوئے انسان کی حفاظت کرتی ہیں۔ مسلمان اپنی دعا میں ان کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

۱۴- اور دو فرشتے تو انسان کے لیے مستقلاً دائماً کراماً کاتبین ایسے امور ہیں جو اس کے تمام اعمال کو لکھتے ہیں پس نعبد و نستعین سے اشارہ اس طرف بھی ہے کہ بندۂ مومن اس معنی کر بھی اپنے کو اکیلا نہ سمجھے بلکہ ان ملائکہ کی طرف سے بھی جن کا مقام عبادت زمین کے بجائے آسمان ہے ان کی طرف سے وکیل بن کر کہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔

۱۵- نیز حسب ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے وہ بقاعدۂ الارواح جنود مجندۃ ایک ہی سلسلہ میں منسلک شمار ہوتا ہے پس مومن قانت ایسے تمام محب اور محبوب افراد کو بھی شامل کر کے کہتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔

پھر جب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان کے ہر جزو کل سے حتیٰ کہ اس کے ہر بن مو سے نعبد و نستعین کی یہی مقدس دعا و ندا بار بار بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتی رہتی ہے اور جو

اقرار ربوبیت ازل میں کیا گیا تھا یہ عمر مستعار اسی کے اعادہ و تکرار میں ختم کرنے کے لیے دی گئی ہے جیساکہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ سے ظاہر ہے اور اس اسلوب جمعیت سے جسم و روح کے جملہ لوازمات و متعلقات کا استحضار مطلوب الٰہی ہے تو یقیناً اس کے تمام اجزاء نامیہ کا جن پر دعائے مسلم کا ہمہ وقت نزول رہتا ہے مقصود صراط تک پہنچنا ایک فطری امر ہوگا جس کی پہلی منزل دربار کعبہ ہے اور دوسری منزل عرش اعظم اور دربار آخرت ہے۔ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ اور جبکہ نعبد و نستعین و اہدنا میں اس قدر حیثیات ملحوظ باری تعالیٰ ہیں جن سب کا احاطہ بشری طاقت سے باہر ہے اور صرف نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ میں الف کے بجائے نون۔ رکھدئے جانے سے بلاغت و جامعیت کا وہ مرتبۂ لطیف و اعلیٰ پیدا ہوگیا ہے جس کے بیان پر بشر کو پوری قوت و قدرت بھی نہیں ہے۔ تو اگر ہم اس عموم اعجاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس اسلوب جمعیت کو دیگر مقامات قرآن کی مدد سے اس طرح تعبیر کریں کہ جہاں کہیں یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے وہاں ذات مع صفات مراد ہوا کرتی ہے تو غالباً یہ وجہ لطیف بھی درجۂ بداعت کو پہنچے بغیر نہ رہے گی۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ انسان خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ جو صفتیں خدا میں ذاتی اور اصلی ہیں وہی انسان میں اس کی عطا کردہ ظلی اور مستعار ہیں اور جیسے خدا کی حکومت و ربوبیت میں ہزاروں مستقل عالم ہیں گویا ہر صفت کا ایک جدا عالم ہے اور ذات واجب تعالیٰ سب کو محیط اور جامع ہے اسی طرح انسان میں بھی ایک ایک صفت کا ظہور گویا ایک مستقل عالم سمجھنا چاہیے۔ پس اس لحاظ سے بھی مومن قانت کو اِهْدِنَا اور نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ کے صیغوں سے استدعا اور عرض حال کا حکم دیا گیا ہے یعنی جس طرح خداوند رب العالمین جب

اپنے کو جمع کے صیغوں سے ظاہر فرماتا ہے تو وہاں ذات واجب تعالیٰ کو مع صفات کے ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے' اسی طرح انسان کو بھی خدا نے اپنی بارگاہ میں استدعا پیش کرتے وقت یہ ہدایت فرمائی ہے اور ایسے جملے انسان کے لیے تجویز فرمائے ہیں جن میں نہ صرف انسان کی ذات ہی مراد ہو بلکہ اس کی ذات مع صفات کے مراد ہوا کرے۔

حضرات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ آیت الکرسی میں خدا نے اپنی چار اعلیٰ صفتوں یعنی علم حیات قیومیت اور قدرت کا ذکر فرمایا ہے اور تمام عالموں کے قیام و بقا میں یہی چار صفتیں اصل الاصل ہیں اور باہمدگر اسی طرح مربوط و مانوس ہیں جیسے کرسی کے چاروں پائے ایک دوسرے سے مربوط ہوا کرتے ہیں اور ان چاروں صفتوں میں کچھ ایسا مخصوص ربط اور ارتباط اور علاقہ ہے کہ بلا تشبیہ ایک صفت دوسری صفت کا رنگ اختیار کرتی ہے) تو دوسری صفت تیسری صفت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں نہ صرف صفت علم ہی اس عالم میں قرآن کی مربی و محافظ ہے بلکہ صفت قدرت و قیام اور صفت حیات بھی حفاظت میں مساوی رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بہرحال انہی صفتوں کا ظہور ہے جو انسان و حیوان اور کل مخلوق کے انواع و افراد درجہ بدرجہ زندہ و قائم اور عالم و قادر نظر آتے ہیں پس کلام پاک میں جہاں جہاں ان صفات جلیلہ کی کارفرمائیوں کا ذکر ہے وہاں اکثر و بیشتر حق تعالیٰ نے اپنے کو جمع ہی کے صیغوں اور ضمیروں سے تعبیر فرمایا ہے جس سے نہ صرف ذات واجب تعالیٰ کی طرف اشارہ منظور ہوتا ہے بلکہ ذات واجب تعالیٰ مع صفات کے مراد ہوا کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر جن مقامات میں خدا نے اپنے کو واحد متکلم کے صیغوں سے یا ضمیروں سے تعبیر فرمایا ہے جیسے اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ، وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ اور اِنِّیْ مَعَكُمْ

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ الخ تو یہ دونوں قسم کی تعبیرات خالی از حکمت ہو جائینگی۔ حالانکہ کلام حکیم فعل حکیم کیطرح کبھی خالی از حکمت نہیں ہو سکتا اور بلاشبہ کلام حکیم کا ایک ایک نقطہ اور اس کا ایک ایک شوشہ بھی بلاغت و منفعت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کہا جائے کہ جہاں خدا نے اپنے کو جمع کے صیغوں سے تعبیر فرمایا ہے وہاں اس کو محض اپنی تعظیم کا اظہار مقصود ہے تو اس قسم کی تعظیم کا اسلوب بھی خدا کے لیے قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ اگر اس قسم کی تعبیر سے تعظیم کا ارادہ فرماتا تو وہاں فرماتا جہاں اس نے اپنے اسم ذات کو ذکر فرمایا ہے چنانچہ اسی نظریہ کے موجب اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ کے بجائے اِنَّنَا نَحْنُ اللّٰہُ ہونا چاہیے تھا حالانکہ انا کی ضمیر ہی یہاں زینت کلام کی موجب ہے۔ اور اس قسم کی جملہ تعبیرات سے خداوند قدوس وحید منزہ و مبرا ہے معلوم ہوا کہ جہاں جمع کے صیغوں سے خدا نے اپنے کو تعبیر فرمایا ہے وہاں تو اس نے اپنی ذات پاک کو معہ اپنی صفات متعددہ کے مراد لیا ہے اور جہاں واحد کی ضمیروں یا صیغوں سے اس نے اپنے کو تعبیر فرمایا ہے۔ وہاں صرف مرتبۂ ذات ہی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ پھر حمید و مجید اور غنیؐ عن العالمین کو ایسی تعبیروں کی جن سے محض تعظیم کا اظہار ہو ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ خود وہ حمید و مجید ہے۔ البتہ اس نے جہاں اپنی عظمت و کبریائی کا اظہار فرمایا ہے وہ محض بندوں کی آگاہی کے لیے فرمایا ہے جب دنیا کے صاحبان کمال اپنے کمال کو چھپانے کی سعی کیا کرتے ہیں اور جو اظہار بھی کرتے ہیں تو محض نفع رسانی کے لئے تو خدا تو سرچشمہ کمالات ہے اور بہت سے کمالات تو صرف اسی کے لیے مختص ہیں پھر وہ کیسے اس کو گوارا فرما سکتا ہے۔ ہاں اس نے اپنی عظمت و شان کو جہاں بیان کیا ہے تو اس کا اسلوب اکثر بشیر یہ ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ ۔ اور ھُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ باقی جیسے ہم اور آپ اپنے لیے جمع کے صیغوں کو بول کر اپنی بڑائی کا اظہار کیا کرتے ہیں مالک الملک کو اس قسم کی تعبیرات کی حاجت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی تعبیرات پر خدا کی تعبیرات کو قیاس نہیں کرنا چاہیے خدا نے جہاں اپنے کو جمع کے صیغوں سے ظاہر فرمایا ہے۔ وہاں اس نے اپنی ذات پاک کو معہ اپنی صفات جلیلہ کے مراد لیا ہے لیکن اگر یہ مراد نہ لی جاوے تو پھر اسلوب جمع متکلم سے مخالفین و سفہاء سرے سے خدا کی وحدانیت ہی کا انکار ثابت کرنے لگیں گے اور کہیں گے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ مارنے والا خدا جدا ہے اور جلانے والا جدا ہے اور بارش برسانے والا خدا جدا ہے وہ بالکل صحیح ہے پس ایسے جملہ مواقع قرآنیہ میں ذات واجب تعالیٰ معہ لحاظ صفات کمالیہ ہی مراد ہوا کرتی ہے اور یہی اسلوب وقت عبادت بندۂ مومن کو بھی نعبد و نستعین سے سکھلایا گیا ہے تاکہ وقت دعا و استدعا انسان کی ذات معہ صفات اربعہ کے مراد ہو تاکہ خدا کی طرف سے بھی جواب میں جو رحمت و برکت دربار الٰہی سے آئے وہ خدا کی ذات اور اس کی صفات دونوں کی طرف سے آئے چنانچہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ۔ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے دیکھیے انسان کی خلقت علم و حیات و قیام و قدرت کی کرشمہ سازیوں سے عمل میں آئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو لَقَدْ خَلَقْتُ الْاِنْسَانَ سے نہیں بلکہ خَلَقْنَا سے تعبیر فرمایا ہے اور جہاں بندہ کی جسم و روح کو اپنی تجلیات علم و حیات و قیام و قدرت کا مظہر اکمل ظاہر فرمایا تو وہاں بھی نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ فرمایا اَنَا اَقْرَبُ اِلَيْهِ نہ فرمایا۔ اور اس اسلوب جمعیت سے یہ واضح فرما دیا گیا کہ انسان کی ساخت اگر صفات اربعہ کی رہین منت ہے تو اس کا قیام و بقا بھی

انہیں کا رہین منت ہے۔

ایک حکمت نعبد و نستعین میں یہ بھی ہے کہ انسان کے دل سے یہ شبہہ بھی مٹ جائے کہ خدا نے جہاں جمع کے صیغوں سے اپنے کو ظاہر فرمایا ہے تو اس سے وہ اپنی وحدانیت کا انکار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد خود بندہ کو بھی اپنی وحدت کے متعلق جواب سوچنا ایک قدرتی امر ہوگا۔ اب ہم اس اسلوب جمعیت کو کلام پاک کی بکثرت آیتوں میں سے بطور نمونہ چند آیتوں سے دکھلانا چاہتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ خداوند علام الغیوب باوجودیکہ بے چون و بے ہمتا ہے مگر جہاں اس کو اپنی ذات پاک کا مع صفات اربعۂ متعددہ کے اظہار مقصود ہوتا ہے جن کی حکومت و سیادت واسطہ و بلا واسطہ عناصر اربعہ اور ان کے مجموعہ ہائے مختلفہ پر فائض و مشتمل ہے اور جو صفات اربعہ بقیہ صفات خداوندی کے لیے نمایندگی میں وہی مرتبۂ خلافت رکھتی ہیں جو چار فرشتے بقیہ فرشتوں پر رکھتے ہیں یا عناصر اربعہ کو تمام عنصری مخلوق پر حاصل ہے یا مثلاً جیسے خلفاء اربعہ کو تمام صحابہ پر کرامت و فوقیت حاصل ہے یا جو مرتبہ وزراء سلطنت کو حکام سلطنت سے ہوتا ہے تو ایسے تمام مقامات میں خدا نے اپنے کو جمع ہی کے صیغوں یا ضمیروں سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ کلام پاک میں خود کلام پاک کے متعلق ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اس کا ترجمہ بھی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رح نے بہت ہی عجیب و لطیف فرمایا ہے یعنی ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔ یہاں حفاظت ذکر حکیم کے لیے واحد کا صیغہ بھی لایا جا سکتا تھا لیکن حفاظت و صیانت اور اس قسم کے جملہ امور چونکہ صفات خداوندی ہی سے متعلق ہیں اور مرتبۂ ذات بہت اعلیٰ مرتبہ ہے، اس لیے اس قسم کے جملہ مواقع میں جن کا تعلق اس عالم کے کاروبار سے ہوتا ہے جمع ہی کے صیغوں سے تعبیر ہوتی ہے اسی لیے آیۃ مذکورۃ الصدر میں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ ہی اس

نصیحت و نور کو عرش سے اتارا ہے اور ہم آپ ہی اس کی نگہبانی اس عالم میں کرنے والے ہیں یعنی جس طرح عناصر اربعہ کل اجسام کی تربیت مساوی حیثیت سے کرتے ہیں اور بغیر ان کے سلسلۂ اجسام کا قیام و بقا ناممکن ہے اسی طرح نہ صرف صفت علم ہی قرآن کی مربی و محافظ ہے بلکہ صفت قدرت بھی ایک شوشہ کا تغیر اس کے لیے جائز نہیں رکھتی۔ نہ صرف صفت قیام ہی سے اس اساس دین قیم کو عالم میں قائم و باقی رکھا جائے گا بلکہ صفت حیات کی کارفرمائیاں بھی بدرجۂ اتم روح قرآنی کی محافظ بن کر سامان حیات کو عالم میں زیادہ کریں گی اور جس طرح خدا کی تجلیات اربعہ علم و حیات قیام و قدرت نے کعبہ مقدس کو عالم میں امن و جنگ کا مدار ٹھیرا دیا ہے چنانچہ یہی بیت عتیق ایک طرف اگر عالم کے لیے قیاماً للناس ہے تو دوسری طرف یہی مقدس جلوہ گاہ سبحانی اور دربار ارضی، ظالموں اور سرکشوں کی گردنیں بھی توڑ ڈالنے والا ہے اسی طرح ان تجلیات اربعہ کا مجموعہ اور شئون ذاتیہ کا مخزن قرآن کریم ہے جو قلوب مومنین کے لیے باعث ہدایت اور کافروں کے لیے باعث ضلالت ہے اور جس کو اس کے نازل فرمانے والے کی طرف سے راسخین فی العلم کے سینوں میں محفوظ کرا دیا گیا ہے جہاں تک کسی بڑی سے بڑی حکومت و قوت کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ بَلْ هُوَ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيَاتِنَا اِلَّا الظَّالِمُونَ۔ یہی اسلوب جمعیت وہ ہے کہ جب تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم و اسماعیل سے حق تعالیٰ نے عہد لیا تو اس وقت بھی یہی اسلوب ملحوظ و مرعی رکھا گیا۔ کما قال تعالیٰ وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيمَ وَاِسْمَاعِيلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ اور یہی اسلوب اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ میں بھی ہے یہی انداز وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى میں بھی جاری ہے۔ علی ہذا۔ اِنَّا اَنْزَلْنَا

إِنَّا أَعْطَيْنَا - إِنَّا جَعَلْنَاهَا۔ اور دوسرے تمام ایسے مقامات میں بھی یہی دستور جاری ہے اور یہ اسلوب خاص ہم دنیا میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ بلا تشبیہ بلا تمثیل محض اس حقیقت غامضہ کو ذہن نشین کرنے کے لیے آپ ایسا ہی سمجھیں جیسے مثلاً حکومتِ وقت میں یہ دستور رائج ہے کہ جو حکم وائسرائے ہند اپنے اختیارات خاص سے جاری کرتا ہے تو ایسے احکام و اختیارات تیزی کے متعلق تو فرامین سلطنت میں لکھا جاتا ہے کہ مابدولت نے فلاں حکم اپنے اختیارات خاص سے نافذ کیا ہے یا مثلاً فلاں چیز کو ممنوع قرار دیا ہے اور جو حکم معمولاً بمشورہ کونسل و ارکان خاص جاری کیا جاتا ہے تو اس کے متعلق اسی شخص واحد کی طرف سے یہ تعبیر ہوتی ہے کہ گورنر جنرل نے باجلاس کونسل فلاں حکم جاری کیا ہے اور گورنر جنرل باجلاس کونسل فلاں فلاں امور کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ گویا اس تعبیر سے فرمانروائے ہند کو اپنی ذات خاص کا معہ اپنے وزراء خاص کے استحصار کے اظہار مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسلوب فطری و در حقیقت فانی حکومتوں نے خدا کی حکومت ہی سے سیکھا ہے جس کو خدا نے ابتدائے آفرینش سے اپنے لیے محفوظ رکھا ہے اور بندے کو ایما فرمایا کہ جب بھی وہ بجانب رب العرش العظیم دست بستہ کھڑا ہو کر اپنی معروضات اور حاجتیں پیش کیا کرے تو محض اپنی ذات خاص سے نہ کیا کرے بلکہ اسی اسلوب عظیم کے موافق اپنے وزرا علم و حیات، قیام و قدرت سمیت بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہوا کرے تاکہ خدائی دربار سے بھی جس قدر رحمت و برکت کا نزول ہو وہ خدا کی ذات و صفات دونوں کی طرف سے ہو اور اس جامع اسلوب کے اختیار کر لینے سے انسان کا کوئی دینی یا دنیوی مفاد ایسا نہ باقی رہے جو نعبد و نستعین واحد نا کہہ لینے سے ضائع ہو سکے یا تحت المراد نہ آجائے اور رب السموٰت و رب الارض و رب العرش الکریم کی طرف سے بھی بمقابلہ نعبد و نستعین واحد نا کے تین ہی قسم کی رحمتیں انسان کو مقصود اصلی تک پہنچا دیں۔

پس آخر میں اس قسم کی تمام تفاصیل کا خلاصہ صرف حرف نون ہی جاکر منتہی ہوجاتا ہے کہ یہ سب درحقیقت الف کے بجائے نون رکھدیئے جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن اگر انسان اسپر غور کرنے لگے کہ دیگر مواضع قرآنی میں اس حرف سے کیا کیا حکمتیں مراد لی گئی ہیں، اور قرآن حکیم کے تمام حروف کے اندر کس قدر حکمتیں اور اسرار نہاں ہیں تو میرا ایمان ہے کہ انسان کی عمر ختم ہوجائے گی مگر وہ ایک حرف کے بھی پورے اسرار اور اس کی کنہ کو معلوم نہ کرسکے گا۔ ؎

منزل تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۶)

تخلیط و تلبیس اگر کوئی شخص یا گروہ اسلامی تمدن و معاشرت اور مغربی تمدن و معاشرت کے اصولی، مقصدی اور صوری فرق کو اچھی طرح سمجھنے اور دونوں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بعد علی وجہ البصیرت اسلام کو چھوڑ کر مغربی تمدن و معاشرت کو اختیار کرلے تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے عمل میں مختار ہے، اور اگر کوئی شہد کو شہد اور زہر کو زہر جان لینے کے بعد زہر کو اختیار کرتا ہے تو شوق سے اختیار کرے لیکن ہمیں جس چیز پر اعتراض ہے وہ خلط مبحث اور تلبیس حق و باطل ہے۔ بعض لوگ ہیں جنہوں نے نہ اسلامی تمدن و معاشرت کے اصول و مقاصد کو سمجھا ہے، نہ مغربی طرز معاشرت کے اصول و مقاصد کو، اور وہ نادانی سے ان دونوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ ہیں جو قصداً تلبیس سے کام لیے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان کی خواہشات نفس ان کو مغربی تمدن و معاشرت کے طریقے اختیار کرنے پر ابھارتی ہیں، مگر یا تو ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ علانیہ اسلام کو ترک کردیں، یا وہ عام مسلمانوں کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ اِس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں، اس لیے وہ اسلام کے اصول و مقاصد اور اس کے قوانین کے بالکل خلاف ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں، اور پھر قرآن و حدیث کے احکام میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلیں کرکے مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ انہیں کا پسندیدہ طریقہ درحقیقت اسلام کا طریقہ ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے

اس خلط مبحث کو ختم کیا جائے اور تلبیس و تخلیط کے تمام دروازوں کو بند کرکے ان حضرات کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ واضح اور نمایاں راستوں میں سے کسی ایک کو صاف اور سیدھے طریقے سے اختیار کریں، خواہ وہ اسلام کا راستہ ہو یا مغربی تہذیب و تمدن کا راستہ۔

مخالفین حجاب کے تین طبقات اس وقت مسلمانوں کے جس گروہ میں ترک حجاب اور آزادی نسوان کی تحریک پھیل رہی ہے وہ تین مختلف طبقات سے مرکب ہے، اور ہر ایک کا حال جدا گانہ ہے۔

انتہا پسند ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو مغربی معاشرت کے اصول ثلٰثہ (یعنی مساوات مرد و زن، عورتوں کے معاشی استقلال اور دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط) پر ایمان لا چکے ہیں اور انہی اصولوں پر اپنی معاشرت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ عملاً شروع کر چکے ہیں۔ ان کے پیش نظر وہی مقاصد ہیں جو اہل مغرب کے پیش نظر ہیں، یعنی مادی فوائد اور حسی لذتیں۔ ان کے نظریات بھی وہی ہیں جو یورپ سے درآمد ہوئے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہا ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے اور اس کے ساتھ دل بھانے کے فنون سے بھی کماحقہٗ واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح پوزیشن ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ مشترک بجٹ میں اپنا حصہ پورا پورا ادا کرے اور مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بن جائے۔ سوسائٹی میں عورت کا حقیقی مقام ان کی رائے میں یہ ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے سوشل لائف میں ایک عنصر لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں کو حرارت بہم پہنچائے، اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ ان کے دل خوش ہوں، ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں، اور ان کے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آجائے۔ قوم میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے،

میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرے، ورزشوں اور کھیلوں میں حصہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اڑانوں کے ریکارڈ توڑے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے، اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ عورت کی زندگی کا یہ سارا پروگرام جو اپنے اصول و مقاصد سے لے کر اپنی عملی جزئیات تک بعینہٖ وہی ہے جو یورپ اور امریکہ میں مرتب ہوا ہے، ہر قسم کی تنقید سے بالاتر، بلکہ آئی ڈیل پروگرام سمجھ کر اخذ کیا گیا ہے، اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کو عین مطابق اسلام قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اسلام مادّی ترقی میں مانع نہیں ہے، اور مادی ترقی کی کوئی صورت اِس صورت خاص کے سوا متصور نہیں!

معتدلین | دوسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے جن میں آجکل نیم حجاب اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَاۤءِ کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے دلوں میں اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق تہذیب شرافت اور حسن سیرت کے اُن معیاروں کو مانتے ہیں جن کو اسلام نے پیش کیا ہے، اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہشمند ہیں، اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن و معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہونے چاہئیں، مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر رکھتے، کچھ جھجکتے اُسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں، اور بیٹیوں کو لیے چلے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کر کے

یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کرلیں گے، یعنی ان کے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہیں گے، ان کی عائلی زندگی کا نظم بھی برقرار رہیگا، اوراس کے ساتھ ان کی معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیوں کو چھوڑکر صرف اس کی دلفریبیاں، اس کی لذتیں اوراس کی مادی منفعتیں بھی جمع کرلے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹ کر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے شدید تر اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کردینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اسی حد پر روک رکھیں گے جس کو آپ نے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بے باکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ پر لڑکیوں کی تعلیم، بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اس کی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ آئندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی ایک صریح نادانی ہے۔ تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقہ کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی ترقی کرکے ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی اس کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوگئے تھے، بلکہ اس کے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ

اس طریقہ پر چل رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے دراصل اُس سفر کی ابتدا کی ہے جس کی آخری منزلوں تک اگر وہ نہیں تو ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہے گی۔

منفعلین | تیسرا گروہ سفہا، اور منفعلین کا ہے جن میں خود سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے یہ دوسروں کو جیسا کرتے دیکھتے ہیں ویسا ہی خود بھی کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ خفیف العقل ہیں اس لیے طبعًا ان کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہوتا ہے جو انھیں خوشنما نظر آتے ہیں، اور جن پر چلنے والوں کو وہ خوش حال اور ترقی یافتہ پاتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت سب سے زیادہ خطرے میں ہیں اگران کا وبال پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے، اور انہی دونوں طبقوں کے درست ہونے یا بگڑ جانے پر ان کے بھی درست ہونے یا بگڑ جانے کا انحصار ہے۔

فیصلہ کن سوال | اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک راستہ مغربی تہذیب کا ہے، اور دوسرا راستہ اسلامی تہذیب کا۔ یہاں ہم کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون کس راستہ کی طرف جانا چاہتا ہے، اور اس فیصلہ کا انحصار ایک بنیادی سوال پر ہے۔ سوال یہ ہے:-

کیا آپ مغربی معاشرت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرز معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی، بے عصمتی، اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی

شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں ؟ حتیٰ کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت جنسی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی وجسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے ؟ ۔

اگر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تأمل مغربی راستے پر تشریف لے جائیے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیے اس راستہ پر جانے سے پہلے آپ کو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑے گا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکہ نہ دے سکیں، اور آپ کی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجب ننگ و عار نہ بن سکیں ۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں، جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول مل سکے، جس میں عورت اور مرد اپنے اپنے تمدنی فرائض کو بہیمی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق انجام دے سکیں، جس میں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو، جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جس میں انسان کی خانگی زندگی اس کے لیے سکون و راحت کی جنت، اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گہوارہ، اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشترک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اس راستہ پر قدم رکھنے سے

پہلے آپ کو ان غیر معتدل مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دلفریب مظاہر کو دیکھکر پیدا ہوگئی ہے۔ ان نظریات اور تخیلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے آپ نے مستعار لے رکھے ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑے گا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے، اس کے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اُس نے وہی ایک نظام معاشرت وضع کیا ہے جیساکہ اس کے مقاصد اور اس کے اصول اور اس کے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظام معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جس کے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیاتِ انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور جس کے بغیر یہ نظام معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کی طرح کوئی خیالی اور وہمی نظام نہیں ہے، بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے، اور اس طویل مدت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اس کے اثر سے ان خرابیوں کا عشر عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہوچکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظام معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضابطہ اور اس کے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپ کو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالے ہوئے یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظام معاشرت کی طبیعت اور اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

اب وہ گروہ جو مغربی تمدن کا راستہ علی وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے، ہمارا مخاطب نہیں ہے۔ ہمارا خطاب صرف ان لوگوں سے ہے جو اسلام کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اور ان

شرائط کی پابندی پر آمادہ ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تفہیم ہمارے فرائض میں سے ہے، اور ان کو اسلامی نظم معاشرت کی روح، اس کے مقاصد، اس کے اصول، اس کے تحفظات اور اس کے ضوابط سے اچھی طرح روشناس کرادینا ضروری ہے، تاکہ وہ بصیرت کی روشنی میں اس راستہ پر چل سکیں اور ان میں خود اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ جب کوئی خلاف اسلام طریقہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اس کو پہچان لیں اور بلا تامل رد کر دیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ اسلامی نظام معاشرت کی فطری اور سائنٹفک بنیاد کیا ہے۔

صنفی کشش کی گیرائی فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین" یعنی دو کرلیسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں، دوسری انواع کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس تقسیم اور اس طبعی یا صنفی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اس حد تک رکھا گیا ہے جس حد تک ہر نوع کے بقاء کے لیے ضروری ہے، اور ان کی جبلت میں ایسی قوت ضابطہ رکھدی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اس حد مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ بخلاف اس کے انسان میں یہ میلان غیر محدود اور غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اس کی جبلت میں کوئی ایسی قوت ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب وانجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ ان کے جسم کی ساخت اور اس کے تناسب اور اس کے رنگ روپ اور اس کے لمس اور اس کے ایک ایک جز میں

کشش پائی جاتی ہے، ان کی آواز، رفتار، گفتار، انداز و ادا ہر ایک میں کھینچ لینے کی قوت موجود ہے۔ گرد و پیش کی دنیا میں بھی بے شمار اسباب پھیلے ہوئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں جمال فطرت کا کوئی مظہر اور حسن کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جس دور میں انسان صنفی تعلق کے قابل نہیں ہوتا۔ اس میں نہ تو محبت اور عشق کے ولولے ہوتے ہیں، نہ مظاہر جمال میں سے کوئی چیز اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہے، اور نہ وہ کسی شے میں کوئی کشش پاتا ہے۔ پھر انسان کے نظام جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں طاقت کا جو زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوت حیات اور قوت عمل بھی ہے، اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔ وہی غدد جو اس کے اعضاء کو جیون رس (ہارمون) بہم پہنچاتے ہیں، جن سے چستی اور توانائی اور ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا کرتے ہیں، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں، اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کی تخلیق کریں، ان جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور بھبن کے گوناگون آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اس کی آنکھوں اور اس کے کانوں اور اس کی شامہ اور لامسہ حتیٰ کہ اس کی قوت متخیلہ تک میں فراہم کر دیں۔ قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے اس کے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا سر رشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اس کو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے شباب کا زمانہ جو دراصل اس کے عمل کا زمانہ ہے، اس میں یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ

بسا اوقات وہ پہلے داعیہ کو دبا لیتا ہے اور اس کے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دیدینے اور اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تأمل نہیں ہوتا۔

تمدن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر | یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیونکہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اُس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسباب فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے، بلکہ وہ کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ اب غور کیجیے کہ اس معاملہ میں کونسا بڑا مقصد فطرت کے پیش نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہ آئے گی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے بخلاف، نوع انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا جو داعیہ رکھا گیا ہے وہ محض جسمانی اتصال اور فعل تناسل کا طالب نہیں ہے بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا طالب ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان، اس کی قوت مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔

اس میں جتنی خواہش اور جتنی صنفی کشش رکھی گئی ہے، اگر اُسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اس کی صحت جواب دے دے اور عمر طبعی کو پہنچنے

سے پہلے اس کی جسمانی قوتیں ختم ہوجائیں۔ یہ بات بھی اس امر کی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا مقصود یہ نہیں کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور ان کے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا، اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ رکھا گیا ہے، جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے مگر انسان کی صنف اناث میں اس کی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے اور اس کو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعہ سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور اس میں اپنے کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلق صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ ان کو باہمی تعاون اور تعامل پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد ان سے الگ ہو جاتے ہیں پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اس کے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے،

تمام عمر گرفتار رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اِس کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے اور اس کے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حد امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسباب زندگی بہم پہنچا سکے اور اپنی محنتوں کے نتائج صرف انہی کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے، پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے، پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک ان کے درمیان تعاوُن اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے، اور اس طرح ایک نظام تمدّن وجود میں آجائے۔

تمدن کا بنیادی مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اس کے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جس کی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں، اس کا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے، فطرت حق نے اس کو تمدّن انسانی کی اصلی قوت محرکہ بنایا ہے، اور اسی میلان و کشش کے ذریعہ سے وہ انسان کی دونوں صنفوں کو محبت اور تعاون کے رشتہ میں وابستہ کر کے ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اور معاشرت (سوشل لائف) کی بنیاد رکھتی ہے۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل تمدن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اس کی بہتری و بدتری، اور اس کے استحکام و ضعف کا انحصار ہے۔ نوع انسانی کے ان دونوں حصوں

میں ایک تعلق تو محض حیوانی اور خالص صنفی اور سراسر شہوانی ہے، جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں اور اس تعاون میں اُن کی صنفی محبت ایک واسطہ اتصال کے طور پر کام دے۔ یہ دونوں قسم کے تعلقات بجائے خود ضروری ہیں، مگر تمدن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

مدنیت صالحہ کے لوازم

آئیے اب ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کرکے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدن کے لیے عورت اور مرد کے بہیمی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

میلان صنفی کی تعدیل

سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے جس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ انسان پر اندر سے بھی محیط ہے اور باہر سے بھی، اور اس کے معلوم اور غیر معلوم محرکات و دواعی فطرت نے اس کثرت سے فراہم کیے ہیں کہ انسان ان کا شمار بھی نہیں کرسکتا۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود اتنے انتظامات کیے ہیں اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر اس کی پرورش اور اس کی تکثیر کے اسباب مہیا کرے، اور ایسا طرز تمدن اختیار کرے جس میں اس کی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں تو یہ چیز بڑھتے بڑھتے ایک ایسی دوزخ بن سکتی ہے جو انسان اور اس کے تمدن دونوں کو کھا جائے۔ صنفی تعلق اور اس کے مبادی اور اس کے محرکات میں سے ہر چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں اس نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیر تمدن کے لیے لگائی

لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے، اور ہو رہا ہے، اور بارہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے۔ شہوانیت ان میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ ان کے تخیلات، ان کے افسانے، ان کے اشعار، ان کی تصویریں، ان کے مجسمے، ان کے عبادت خانے، ان کے محلات سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جا رہی ہیں ان کے حالات بھی دیکھ لیجیے۔ وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ، اور لائٹ لٹریچر، اور جمالیت اور ایسے کتنے ہی خوش نما اور معصوم ناموں سے موسوم کریں مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورت کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جا رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر ہوا جاتا ہے؟ وہ کونسی شئے ہے جس کے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے ہل من مزید کا تقاضا ہے؟ اس کی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اس کا انجام تباہی اور یقینی تباہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت اور پیہم ہیجان

اور مسلسل تحریک سے نسلیں کمزور ہو جائیں گی، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشوونما بگڑ جائے گا۔ قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں گے، فواحش کی کثرت ہوگی، امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلینگی برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں گی، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملیں گے، بلکہ فطرت نے ان کے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے اس کو مقاصد فطرت کے خلاف استعمال کرکے وہ اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں گے، حتٰی کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں گے۔ ان کی بہیمیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور ان کا اخلاقی انحطاط ان کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

ایسا ہی انجام اس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کرے گا۔ جس طرح صنفی میلان کو حد اعتدال سے زیادہ بڑھانا مضر ہے اسی طرح اس کو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظام تمدن انسان کو سنیاس اور برہمچرج اور رہبانیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے وہ فطرت سے لڑتا ہے، اور فطرت اپنے مد مقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دراصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ تاہم اس قسم کے تصورات کو دلوں میں راسخ کرکے انہی کے زیر اثر ایک شدید غیر صنفی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں صنفی تعلق ایک ذلیل اور قابل نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھی جائے اور اس سے اجتناب کو پسندیدہ قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ خود ہی نہ دبے گا بلکہ انسان کی ذہانت اور قوت عمل، اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لیے کر دب جائیگا۔

اس کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ اس کا خون سرد اور منجمد ہو جائے گا۔ اس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ انسان کی سب سے بڑی قوتِ محرکہ یہی صنفی قوت ہے۔

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا، اور اسے ایک مناسب ضابطہ سے منضبط کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے۔ اس کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف ہیجان و تحریک کے ان تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف طبعی و فطری تحریک کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشارِ فطرت کے مطابق ہے۔ یعنی مرد اور عورت کی مستقل وابستگی جو ایک خاندان کی اساس بن جائے۔

نظامِ عائلی کا تحفظ خاندان کی تاسیس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نظامِ عائلی کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ایسے تمام اسباب کی روک تھام کی جائے جو اس نظام میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ مجرد فطرتِ حیوانی کے اعتبار سے دیکھیے تو مرد اور عورت کی صنفی کشش بجائے خود کسی ضابطہ سے آشنا نہیں ہے۔ جس طرح ہر آگ جلانے اور ہر آتش پذیر شے جل جانے کے لیے مستعد ہے، اور دونوں کا اجتماع اس کا مقتضی ہے کہ فعلِ سوزش واقع ہو، اسی طرح ہر مرد اور ہر عورت کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش موجود ہے اور یہ کشش ان کے اتصال کا اقتضا کرتی ہے۔ یہ فطرتِ حیوانی انسان کی جبلت میں پیوستہ ہے اور اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے۔ اس سے اوپر فطرتِ انسانی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور پائداری ہو، بہائم کا سا انتشار نہ ہو کہ بلا امتیاز ہر کشش ایک اتصال کی صورت اختیار کر لے، انساب مخلوط نہ ہونے پائیں، اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو تاکہ والدین ان کی پرورش میں تعاون

کریں اور ان کے درمیان خونی رشتے قائم ہوں جو باہمی محبت و معاونت اور انتقال میراث کا ذریعہ بنیں۔ مگر فطرت انسانی کا یہ اقتضا اتنا طاقتور نہیں ہے کہ تنہا یہی انسان کو اس عقلی طریقہ کا پابند رکھنے کے لیے کافی ہو۔ فطرت حیوانی اس سے زیادہ طاقتور ہے، اور وہ اس سے جنگ کرنے پر آمادہ ہے۔ دنیا میں جس کثرت سے زنا کا ارتکاب ہو رہا ہے، اور جس کثرت سے تعلقات صنفی میں انتشار کی مثالیں ملتی ہیں وہ سب اسی فطرت حیوانی کے کرشمے ہیں، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر معمولی "انسانیت" رکھنے والے آدمیوں کے سوا (جو بہت ہی کم ہوتے ہیں) عام انسان خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، اس طاقت کو بالکل دبا دینے اور اپنے جذبات و افعال کو سراسر فطرت انسانی کے مقتضیات کا تابع رکھنے پر قادر نہیں ہیں پس ایک صالح تمدن کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تعلقات صنفی کے لیے ازدواج کا ایک معروف طریقہ مقرر کر دے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ اس طریقہ کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ دائرۂ ازدواج سے باہر صنفی تعلقات کا انتشار روک دیا جائے اور دائرۂ ازدواج کے اندر دوسروں کی مداخلت بند کر دی جائے۔ فطرت حیوانی کے مقابلہ میں فطرت انسانی کو ہر موقع پر تمدن و تہذیب کے نظام سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے، چوری، لوٹ مار، قتل و خون، دغا و فریب، غصب حقوق اور دوسرے کثیر التعداد افعال جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے اثر سے کیا جاتا ہے، اس کی روک تھام کے لیے نظام تمدن ہی فطرت انسانی کی مدد کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو فعل تمدن کی عین بنیاد پر حملہ کرتا ہے، اور جس کے محرکات ان تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی ہیں، اس کی روک تھام میں مدد دینے سے خود تمدن ہی انکار کر دے؟ جو تمدن اس معاملہ کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کو محض ایک "خوش وقتی"[1] قرار دیتا ہے۔ اور "آزادانہ تخم ریزی"[2] کے ساتھ نہ صرف رواداری

[1] تہذیب جدید میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ تعلق کو Having a good time سے تعبیر کیا جاتا ہے

[2] Sowing wild oats یہ بھی تہذیب جدید کا ایک معروف محاورہ ہے۔

برتتا ہے، بلکہ اس کی اشاعت میں خود مددگار رہتا ہے وہ دراصل آپ اپنا دشمن ہے۔ وہ ہرگز ایک صالح تمدن نہیں ہے۔ صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اپنی خلاقی تعلیم سے دلوں میں اس چیز کی نفرت بٹھائے، اپنے قانون کی طاقت سے اس کو سختی کے ساتھ روکے اور نظام معاشرت کے ضوابط سے مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں عائد کر دے کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق پیدا کرنے کی طرف مائل بھی ہوں تو ان کی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔

اس معاملہ کو محض افراد کے اپنے باطنی احساس اور ان کے ضمیر کی آواز، اور ان کے اخلاقی وجدان اور تعلیم و تربیت کے اثرات پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلاشبہ تہذیب کی غایت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ وہ خود بخود سوسائٹی کے قوانین کا احترام کریں، اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے اتنی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کیا آج تک تعلیم و تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچنے میں اس حد تک کامیاب ہو سکی ہے کہ سوسائٹی کے نظام اور اخلاقی ضوابط کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانہ قدیم اور "قرون مظلمہ" کو چھوڑیے۔ یہ بیسویں صدی، یہ "قرن منوّر" آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے مہذب ترین ممالک کو دیکھیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جن کو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے۔ کیا وہاں اس تعلیم اور تربیت اور تہذیب نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور اس روشن زمانہ میں بھی سوسائٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جا سکا ہے، اور ہر اس فعل کو جسے جرم سمجھا جاتا ہے انسدادی اور تعزیری دونوں قسم کی تدبیروں سے روکنے کی

کوششیں اب بھی کی جا رہی ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کو اس عام قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے؟ حالانکہ ان تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے تمام جرائم سے زیادہ خطرناک ہے، اور اس جرم کے محرکات تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی اور کثیر ہیں۔ ہاں اگر یہ فعل جرم ہی نہیں ہے، بلکہ محض ایک "خوش وقتی" ہے جس کو برٹرینڈرسل کے بقول تھوڑی سی فراخ حوصلگی برت کر گوارا کر لینا چاہیے، تو اس کے لیے انسداد اور تعزیر کی بلاشبہ ضرورت نہیں، بلکہ ایسی ذرا سی چیز کے لیے ضمیر اور اخلاقی وجدان میں بھی کوئی گرفتگی کیوں ہو؟

بعض حضرات کا ارشاد ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا، اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں لگانا دراصل ان کے اخلاق اور ان کی سیرت پر ایک حملہ ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے، اور ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتبار ہے، نہ مردوں پر۔ بات نہایت معقول ہے۔ مگر اسی طرز استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کر لیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکاب جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے اس کے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ان سب لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جن پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہے۔ اس طرز استدلال کے مطابق تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مجرم قرار دیے جاتے ہیں مگر آپ کی عزت نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپ کے احساسات

اس قدر نازک ہوگئے ہیں؟

درحقیقت یہ سب بہانے اس لیے گھڑے گئے ہیں کہ نفس شریر صنفی تعلقات میں آزادی اور اختلاط کے لیے بے تاب ہے اور اس پر کوئی پابندی اُسے گوارا نہیں ہے۔ مگر اسی شرارت نفس کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اساس تمدن کی حفاظت کے لیے امتناعی تدابیر بھی اختیار کی جائیں اور تعزیری تدابیر بھی۔ انسان جب تک انسان ہے، اور اس کی جبلت میں بہیمیت موجود ہے اس وقت تک کوئی ایسا تمدن ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا جو اشخاص کی خواہشات اور ان کے لطف و لذت سے بڑھ کر سوسائٹی کی صلاح کو عزیز رکھتا ہو۔

تعلق زوجین کی صحیح صورت | نظام عائلی کے تحفظ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین ہو، ان کے حقوق و فرائض عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں، ذمہ داریاں ان پر ٹھیک ٹھیک تقسیم ہوں اور خاندان میں ان کے مراتب اور ان کے وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور تناسب میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدن و معاشرت کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے صحیح حل پر نہ صرف نظام عائلی بلکہ پورے نظام تمدن و تہذیب کی صحت و صلاح کا مدار رہے، اور بڑے بڑے تمدن اس کے حل میں ناکام ہوئے ہیں۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے مگر تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان قوموں میں سے کوئی قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی مالک ہوئی ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایسی ایک قوم بھی آج تک دنیا میں نہیں ابھر سکی۔ اس نے کوئی عزت اور طاقت حاصل کی۔ نہ کوئی کارنمایاں انجام دیا۔

بیشتر اقوام عالم میں مرد کو عورت پر قوّام بنایا گیا ہے، مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کرلی۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اس کی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی

قسم کے معاشی اور تمدنی حقوق نہ دیے گئے۔ اس کو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمت گار اور مرد کے لیے آلۂ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا۔ خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ بھی کیا گیا تو اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی مطالبات زیادہ دلاویز طریقہ سے پورے کریں، ان کے لیے اپنی موسیقی سے لذت گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذت نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذت جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا۔

مغربی تمدن نے تیسرا پہلو اختیار کیا ہے، یعنی مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمہ داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں۔ معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ بالکل جدید ہے، اور ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا ہے، کیونکہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلہ نہیں ہے۔ نہ اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اس کو ملنے چاہییں۔ لیکن جس حد تک مساوات قائم کی گئی ہے اس نے ابھی سے نظام تمدن میں فساد برپا کر دیا ہے، حالانکہ ابھی اس جدید تنظیم کو شروع ہوئے پوری ایک قرن بھی نہیں گذری ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

یہ تینوں قسم کے تمدن عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیونکہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر عقل سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل

بتا رہی ہے بلکہ یہ بھی دراصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھنا چاہا یا مردنے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنے بہکے ہوئے تخیلات کے اثر سے اختیار کئے ہیں، مگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے، اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں۔ تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل، اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیب نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشوونما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا اپنا پورا حصہ ادا کر سکے اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، اور ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، ان کو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزین کرے، انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی و معاشی حقوق ادا کرے، اور معاشرت میں عزت کا مقام ان کو بخشے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو اور ان کے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہو سکیں جو صرف عزت نفس ہی کے احساس سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، نا تربیت یافتہ، ذلیل اور حقوق مدنیت سے محروم رکھا ہے وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیونکہ انسانیت کے پورے نصف حصہ کو گرا دینے کے معنی خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی

گودیوں سے عزت والے، اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے، اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو، دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کر دی جائیں، اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اس کی تائید میں سائنس کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد و قوت کے لحاظ سے مساوی (equipotential) ہیں۔ مگر صرف یہ امر کہ ان دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے۔ اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت اپنی نمایاں جسدی خصوصیات سے لیکر نسیجی خلایا کے پروٹینی ذرات (Protein molecules of tissue cells) تک میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (Sex formation) واقع ہوتی ہے اسی وقت سے دونوں صنفوں کا جسدی ارتقاء بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ہوتا ہے۔ عورت کا پورا نظام جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ وہ بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کے لیے مستعد ہو۔ ابتدائی

جنینی تشکیل سے لے کر سن بلوغ کو پہنچنے تک اس کے جسم کا پورا نشو و نما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے، اور یہی چیز اس کی آیندہ زندگی کا راستہ معین کرتی ہے۔ بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اکابر فن حیاتیات و عضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اس لیے حرارت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے۔

۲۔ نبض سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہوتا ہے۔

۳۔ Lymphatic glands, tonsils & endocrines میں تغیر واقع ہوتا ہے

۴۔ پروٹینی تحول Protein metabolism میں کمی آجاتی ہے۔

۵۔ فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول (Gaseous metabolism) میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶۔ ہضم، اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی ہو جاتی ہے۔

۷۔ تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸۔ عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔

۹۔ ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے

زیادہ شدید وہ تغیرات ہیں جو نظام عصبی کے اعلیٰ مراکز اور درون افرازی غدد (endocrine glands) میں ہوتے ہیں۔ انہی اعضاء کے صحیح فعل پر تندرستی کا انحصار ہے مگر ایام ماہواری میں ان کے فعل میں اختلال واقع ہوجاتا ہے اور ایک مضطربانہ کیفیت رہتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر (Voicechevsky) نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر (Krschiskovsky) نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانہ میں عورت کا نظام عصبی نہایت اشتعال پذیر ہوجاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے مرتب انعکاسات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم اور بسا اوقات باطل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جن کی وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانہ میں غلط ٹکٹ کاٹ دے گی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائے گی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کرے گی، دیر میں کرے گی اور کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائے گی، غلط جملے بنائے گی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی حرف پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوت استدلال درست نہ رہے گی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اس کا دماغ اور اس کی قوت بیان دونوں غلطی کریں گے۔ ایک مجسٹریٹ عورت کی قوت فہم اور قوت فیصلہ دونوں متاثر ہوجائیں گی۔ ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملیں گے۔ ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کو کھو دے گی، حتیٰ کہ ایک ماہر نطقیات

محض آواز سن کر بتا سکتا ہے کہ گانے والی اس وقت حالت حیض میں ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانہ میں عورت کے دماغ اور اعصاب کی مشین بڑی حد تک سست اور غیر مرتب ہوجاتی ہے۔ اس کے اعضاء پوری طرح اس کے ارادہ کے تحت عمل نہیں کرسکتے بلکہ اندر سے ایک اضطراری حرکت اس کے ارادے پر غالب آکر اس کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو ماروف کردیتی ہے، اور اس سے مجبورانہ افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کی آزادیٔ عمل باقی نہیں رہتی، اور وہ کوئی ذمہ دارانہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔

پروفیسر لاپنسکی Lapinsky اپنی کتاب The Development of Personality in woman میں لکھتا ہے کہ زمانہ حیض عورت کو اس کی آزادیٔ عمل سے محروم کردیتا ہے۔ وہ اس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہوجاتی ہے۔

یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں، اور بآسانی ترقی کرکے مرض کی صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورتیں دیوانی سی ہوجاتی ہیں۔ ذرا سے اشتعال پر غضبناک ہوجانا، وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا حتیٰ کہ خودکشی تک کر گذرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ڈاکٹر (Krafft-Ebing) لکھتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ مند اور خوش خلق ہوتی ہیں ان کی حالت ایام ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے۔ زبانہ ان کے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے۔ وہ چڑچڑی اور جھگڑالو اور کٹکھنی ہوجاتی ہیں۔ نوکر اور بچے اور شوہر ان سے نالاں ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بری طرح پیش آتی ہیں۔ بعض دوسرے اہل فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے

اکثر جرائم حالت حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گذرے گی اور بعد میں خود اس کو اپنے فعل پر شرم آئے گی (Weinherg) اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالت حیض میں یہ فعل کیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ آیا یہ جرم حالت حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے۔

ایام ماہواری سے بھی بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج کا نظام بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ کم مقدار میں ہوتا ہے اس زمانہ میں عورت کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتا جو حمل کے ماسوا ایام میں سنبھال سکتا ہے۔ جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں وہ اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانہ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے۔ اس زمانہ میں کئی مہینے تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے اور ایک ادنی اسی وجہ اس کو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانہ میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس میں تلون پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات پریشان رہتے ہیں۔ ذہن پراگندہ ہوتا ہے۔ شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے۔

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ قبل حمل کی حالت کی طرف واپس جانے کے لیے اعضا میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے تب بھی کئی ہفتے اس کو اپنی اصلی حالت پر آنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر کسی جسمانی یا دماغی محنت کا بار ڈالا جائے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں درحقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس کے جسم کا جوہر اس کے بچے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں سے صرف اس قدر حصہ اس کے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک مدت دراز تک بچہ کی پرورش نگہداشت اور تربیت پر اس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسئلہ رضاعت کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ بچوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ فطرت نے بچہ کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے اس کا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بچے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح تربیت اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچوں سے بے فکر ہو کر بیرون خانہ کے مشاغل میں منہمک ہو سکیں لیکن کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقت مادری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت جس دردمندی اور جس خیر سگالی کا محتاج ہے وہ کرایہ کی اپنی پوسنے والیوں کے سینے میں

کہاں سے آسکتی ہے۔ تربیت اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی وہ نسلیں پھل پھول بھی نہیں لائی ہیں جو بچے پالنے کے ان نئے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں۔ ابھی تک ان کی سیرت ان کے اخلاق، ان کے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربے کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ لہٰذا اس طریقہ کے متعلق یہ دعوی کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پا لیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچے کی فطری تربیت گاہ اس کی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت و استعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈال دیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس کو اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس میں انفعال و تاثر، نرمی و نزاکت، رحم و شفقت، ذکاوتِ حس اور لطافت جذبات کی صفتیں پیدا کی گئی ہیں جو اسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں، اور ایسے کاموں کے قابل نہیں بناتیں جو شدت اور سختی اور تحکم اور مزاحمت کے طالب ہیں۔ اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں پیہم ایام ماہواری کے دورے آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لیکر دس دن تک اس کو کسی بڑی ذمہ داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور ما بعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گذرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت

کے پورے دو سال اس طرح گذرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی اور اپنے سینے کی نہروں سے اس کو سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اس محنت و مشقت میں گذرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لطف، اپنی خوشی، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کر دیتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے اُن فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری کا مطالبہ بھی کیا جائے جن میں مرد اس کا شریک نہیں ہے، اور پھر ان تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہے؟ اُس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقتیں بھی اُٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت و حرفت، اور تجارت و زراعت اور قیامِ امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی برابر کا حصہ لے، ہماری سوسائٹی میں آکر ہمارا دل بھی بھلا، ہمارے لیے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کر؟ یہ عدل نہیں ظلم ہے، مساوات نہیں صریح نامساوات ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اس کو تمدن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں۔ اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اس کی حفاظت کرے۔

یہ وہ تقسیمِ عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے اس فطری تقسیم کے لحاظ سے ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو عورت کو معاشرت میں عزت کا مقام

اور تمدن و معیشت میں جائز حقوق دینے کے ساتھ اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالتا ہے، اور مرد کو بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت سپرد کرتا ہے جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ ممکن ہے کہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر دے، لیکن ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا عورت اپنی افتاد طبع اور فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائے گی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپ کو بچے جننے اور بچے پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا

اب اگر فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ رکھکر خاندان کی تنظیم اور معاشرت میں مرد اور عورت کے مراتب و وظائف کی تعیین کی جائے تو اس کے ضروری ارکان یہ ہوں گے۔

۱۔ خاندان کے لیے روزی کمانا، اس کی حفاظت و حمایت کرنا، اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو۔ اور اس کی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

۲۔ خانہ داری کے فرائض، بچوں کی پرورش اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور انہی اغراض کے لیے اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے تیار کیا جائے۔

۳۔ خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اس کو انارکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج نہ بن جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس رکن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل کے زمانہ میں بگڑتی رہتی ہو وہ ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور اس ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے عورتوں اور مردوں کے حلقہائے عمل مخلوط نہ ہو سکیں۔ (باقی)

مطبوعات

الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان تالیف علامہ ابن تیمیہ ترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب ضخامت تقریباً پونے تین سو صفحات۔ قیمت عہ۔ محمد شریف عبدالغنی صاحبان تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔

علامہ ابن تیمیہ نے اس کتاب میں خدا کے سچے اولیاء اور دنیا کے جھوٹے پیروں میں امتیاز کی علامات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ سے استدلال کر کے ثابت کیا ہے کہ صراط مستقیم اس راستہ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔ ولایت اور تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عقیدہ وہی ہو جو قرآن نے بتایا ہے۔ اور طریقہ وہی ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے اس تعلیم اور اس سنت کے خلاف نہ کسی کا الہام قابل اعتبار ہے، نہ کسی کا قول و عمل۔ اگر کوئی شخص آگ پر چلتا اور ہوا پر اڑتا ہے مگر اس کا عقیدہ قرآن کے خلاف اور اس کا طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے مختلف ہے تو سمجھ لو کہ وہ ہرگز اللہ کا ولی نہیں۔ حق کا معیار ہر حال میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہے۔ دوسرے اشخاص خواہ وہ کتنے ہی بڑے اور نامور کیوں نہ ہوں، خطاء سے معصوم نہیں ہیں۔ ان کا اتباع مسلمانوں کے لیے واجب نہیں کیا گیا ہے۔ وہ جو کچھ کریں اور جو کچھ کہیں اس کو کتاب و سنت کے معیار پر جانچ کر دیکھنا چاہیے۔ جو شخص محض ان کی شخصیت اور ان کے کمالات سے مرعوب ہو کر ان کا اتباع کرے گا وہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیگا۔

دوران تقریر میں علامہ نے بہت سے ضمنی مسائل پر بھی بحث کی ہے جو صدیوں سے امت میں بنائے نزاع ہیں مثلاً توسل، شفاعت، سماع، وحدت الوجود، مشیت و رضا اور طریقت و شریعت وغیرہ۔ ان مسائل میں علامہ کا مسلک معلوم و مشہور ہے اور حضرات اہل تصوف اس پر ان سے سخت ناراض ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے ان کو کافر تک ٹھیرایا ہے لیکن ابن تیمیہ کی اس خصوصیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ہمیشہ قرآن کے محکمات اور احادیث کے صحاح سے استدلال کرتا ہے، اور اپنے استدلال میں تاویلات سے کام نہیں لیتا بلکہ نصوص کے صاف اور کھلے ہوئے معنی لیتا ہے۔ نیز یہ بات بھی اس کی کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صوفیہ کا دشمن نہیں ہے۔ حضرات فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، معروف کرخی، جنید بن محمد بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان دارانی اور شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم سے اس کو عقیدت ہے اور جگہ جگہ ان بزرگوں کے اقوال سے استناد کرتا ہے۔ البتہ وہ ان لوگوں کا سخت مخالف ہے جنہوں نے تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث کے بجائے اشراقی فلسفہ پر رکھی ہے، طریقت کے راستہ کو علانیہ شریعت کے راستہ سے الگ قرار دیا ہے، روحانی ارتقار کے لیے اتباع سنت کے خلاف طریقے نکالے ہیں، رضا اور مشیت کو خلط ملط کرکے اباحت و استلذاذ نفس کے راستے کھولے ہیں، اور معرفت اس کا نام رکھا ہے کہ خالق و مخلوق کو ایک ٹھیرا کر طاعت و معصیت کا امتیاز ہی اڑا دیا جائے اس سلسلہ میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو نہ اس بنا پر قبول کیجیے اور نہ رد کیجیے کہ وہ ابن تیمیہ کے اقوال ہیں، بلکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے معیار پر جانچ کر دیکھیے۔ اگر حق ہے تو مانیے خواہ وہ کسی کے خلاف پڑے، اور اگر باطل ہے تو دیوار پر کھینچ ماریے۔

کتاب کا ترجمہ صاف اور رواں ہے، مگر نظر ثانی کا محتاج ہے۔ بعض مقامات پر مترجم نے اصل کتاب کی عبارتوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اصل عبارت یہ تھی فالعقل

عندھم جوھرٌ قائمٌ بنفسہٖ کالعاقل۔ مترجم نے اس کا ترجمہ یہ کیا "فلسفیوں کے نزدیک عقل ایک جوہر ہے جو بنفسہ قائم ہے مثلاً عاقل"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں، اور معنیٰ بھی غلط ہے۔ صحیح مفہوم یہ ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک جس طرح عاقل ایک جوہر قائم بنفسہٖ ہے اسی طرح عقل بھی بجائے خود ایک مستقل بالذات جوہر ہے۔

صفحہ ۱۱۱ پر یہ فقرہ نظر آیا: "یہ لوگ .... اتحاد کے لفظ سے اس لیے گریزاں ہیں کہ وہ دو چیزوں سے مستلزم ہے جن میں سے ایک دوسرے سے متحد ہوگئی ہو۔ حالانکہ ان کے نزدیک وجود صرف ایک کا ہے"۔ اصل عبارت نکال کر دیکھی گئی تو وہ یہ تھی لانہ یقتضی شیئین اتحد احدھما بالآخر وعندھم الوجود واحد۔ یعنی اتحاد کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہوں پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جائیں مگر یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ وجود ایک ہی ہے اس لیے وہ اتحاد کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۳ پر یہ عبارت بے معنی نظر آئی: "میں اس پروردگار کا منکر ہوں جو کہ نافرمانی کرے"۔ اصل عربی فقرہ نکالا گیا تو یہ تھا: انا کافر برب یُعصیٰ۔ یعنی میں ایسے خدا کو نہیں مانتا جس کی نافرمانی کی جا سکتی ہو۔ مترجم نے یُعصیٰ کو یَعصِی پڑھا اور ترجمہ غلط کر دیا، حالانکہ عبارت کے سیاق و سباق کو دیکھنے سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یَعصِی کہنے کا کوئی موقع نہیں۔

کتابت کی غلطیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ناشرین کو اگر اس کتاب کی دوسری اشاعت کا موقع ملے تو ان غلطیوں کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ (ا۔م)۔

زیارۃ القبور | تالیف علامہ ابن تیمیہ۔ مترجم کا نام نہیں دیا گیا۔ ضخامت ۹۰ صفحات۔ قیمت ۹ آنہ۔ محمد شریف عبدالغنی تاجر کتب۔ کشمیری بازار۔ لاہور۔

یہ رسالہ زیارت قبور اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل پر ہے۔ مصنف نے سب سے پہلے آیات قرآنی سے تعلیم توحید کا اصل مقصود واضح کیا ہے یعنی عبادت اور استعانت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا، اسی کو نافع و ضار اور مجیب الدعوات سمجھنا، اور تمام توجہات کو اسی ایک مرکز پر جمع کر دینا۔ پھر وہ شرک کی توضیح کرتا ہے۔ شرک محض شرک فی الذات ہی نہیں ہے، بلکہ عبادت، اور دعا اور استعانت میں غیر کو شریک کرنا بھی شرک ہے اور سب سے زیادہ جن راستوں میں انسان کے قدم ٹھوکر کھاتے ہیں وہ یہی راستے ہیں۔ مشرکین بھی یہ نہیں کہتے کہ "اللہ" جس ذات کا نام ہے وہ ایک نہیں ہے۔ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اصل خالق یا رازق یا نفع اور نقصان پہنچانے والا اس کے سوا کوئی اور ہے۔ عموماً شرک کی جس صورت میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا کے کاموں میں دوسروں کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخیل سمجھا جاتا ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کے ہاں تقرب، یا دعاؤں کی مقبولیت، یا جلب منفعت و دفع مضرت کے لیے اُن کو خوش کرنا اور ان کو سفارشی بنانا ضروری ہے۔ اگر ان کا ذریعہ اختیار نہ کیا گیا تو خدا اپنے بندوں کی طرف التفات نہ فرمائے گا۔ یہی چیز بنائے فساد ہے، کیونکہ اس سے بندوں کی توجہ خدا سے ہٹ کر مخلوقات کی طرف لگ جاتی ہے، عبد و معبود میں وہ تعلق قائم نہیں ہوتا جو در اصل ہونا چاہیے، بندگی اور توکل اور رضا جوئی اور دعا و عبادت میں جو مرکزیت پیدا کرنا تعلیم توحید کا مقصد اصلی ہے وہ اس سے باطل ہو جاتی ہے۔

ان اصول کو ثابت کر دینے کے بعد مصنف ان مقاصد سے بحث کرتا ہے جن کے لیے قبروں کی زیارت کی جاتی ہے۔ اگر اہل قبور سے براہ راست طلب حاجت کی جائے تو یہ شرک صریح ہے۔ اگر زائر اُن کو مقرب بارگاہ سمجھ کر انھیں شفیع قرار دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ان کی سفارش کے بغیر خدا اس کی بات نہ سنے گا تو یہ ضلالت ہے، کیونکہ خدا کو سنانے کے لیے

کسی واسطہ کی ضرورت نہیں (فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ) اور خدا کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کی جرأت نہیں کرسکتا (مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ) اگر وہ ان سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے خدا سے دعا کریں، تو اہل قبور سے اس قسم کی درخواست مشروع نہیں ہے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض سے زیارت قبور کی اجازت دی، نہ صحابہ اور تابعین اور ائمۂ اسلام نے کبھی ایسا کیا۔ اگر وہ ان کے عمل نیک اور ان کی سیرت صالحہ کا واسطہ دیکر خدا سے دعا کرتا ہے تو یہ ایسا عمل ہے جس کے جواز و عدم جواز میں ابن تیمیہ نے سکوت کیا ہے۔ اگرچہ صحابہ و تابعین وائمہ سے یہ فعل بھی ثابت نہیں ہے، لیکن اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دینے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں۔ رہی زیارت مشروعہ جس کی اجازت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ صاحب قبر پر سلام بھیجا جائے، دعائے رحمت کی جائے، اور خود اپنی موت کو یاد کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مصنف نے ضمناً بہت سے مسائل پر بحث کی ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قوالی علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ السماع والرقص کا ترجمہ از مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ضخامت ۷۲ صفحات قیمت ۶ر۔ محمد شریف عبدالغنی تاجران کتب۔ کشمیری بازار لاہور۔

مصنف علام نے اس رسالہ میں سماع کے مشہور مسئلہ پر بحث کی ہے جو مدتوں سے علماء اور صوفیہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ وہ ان تمام احادیث پر کلام کرتا ہے جن سے جواز سماع پر استدلال کیا جاتا ہے پھر تحلیل کر کے گانے کی ایک ایک قسم اور اس کے مقصود اور اس کے اثرات پر الگ الگ گفتگو کرتا ہے، اور دلائل شرعی سے ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کونسی قسم مباح ہے اور کونسی ممنوع۔ سب سے زیادہ پر لطف بات جو اس نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص درحقیقت قرب الٰہی اور پاکیزگیِ قلب اور طہارت نفس اور لطافت روح کے

سماع چاہتا ہے تو وہ قرآن سُنے، اس سے بہتر اور کونسی چیز ہے جو ان مقاصد کو پورا کر سکتی ہو۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کا کلام گویوں کی زبان سے سن کر بے تاب ہو جاتے ہیں، دھاڑیں مار مار کر رو دیتے ہیں، شدت وجد میں کپڑے تک پھاڑ ڈالتے ہیں ان پر اللہ کا کلام سن کر کوئی اثر نہیں ہوتا، نہ آنکھ سے ایک آنسو نکلتا ہے، نہ گریبان کا ایک تار الگ ہوتا ہے، نہ دل میں کوئی ایسی تپش پیدا ہوتی ہے جو انھیں بے قرار کر دے۔ حالانکہ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ اگر پہاڑ کو بھی اس کے معنی کا ادراک بخش دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لرز اٹھے (م - ا)

الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید تالیف علامہ محمد بن علی الشوکانی - ترجمہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے کینٹب۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۲ار۔ محمد شریف عبد الغنی تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

قاضی شوکانی نے اس رسالہ میں توسّل اور شفاعت اور استغاثہ اور زیارت قبور کے مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا مسلک بھی قریب قریب وہی ہے جو علامہ ابن تیمیہ کا ہے۔ جگہ جگہ علامہ رشید رضا مرحوم اور فاضل مترجم نے حواشی کا اضافہ کیا ہے جن میں بعض مقامات پر بے جا تشدد سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مسائل میں مسلمان عموماً سخت غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں، لیکن جن امور کی حرمت یا کراہت کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے ان پر تاویلات سے حرمت یا کراہت کا حکم لگانا، اور پھر اس میں تشدد برتنا نہ صرف ناجائز ہے بلکہ موجب فتنہ بھی ہے، کیونکہ اس قسم کے تشدد سے دوسرے گروہ میں ضد پیدا ہوتی ہے، پھر وہ حق بات کو بھی نہیں مانتا۔ مثال کے طور پر قاضی شوکانی اہل فضل و علم سے توسّل کو جائز رکھتے ہیں۔ یہ ایک معقول بات ہے، کیونکہ اس کی حرمت یا کراہت پر کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں۔ اسی لیے ابن تیمیہ نے بھی اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لیکن علامہ رشید رضا اور لائق مترجم نے

اس کو بھی ناجائز ٹھیرانے کی کوشش کی ہے اور دلیل میں جو بات پیش کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کا عمل صالح اس کی اپنی اولاد کے سوا دوسروں کے لیے وسیلہ نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے تو حضرت عمر نے حضرت عباس کو اپنی دعائے استسقاء میں کیوں وسیلہ بنایا، اور کیوں تمام صحابہ نے اس کو جائز رکھا؟ اس معاملہ میں زندہ اور مردہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں، کیونکہ جس ذات پاک کے پاس توسل کیا جا رہا ہے اُس کے پاس تو زندوں اور مردوں کے اعمال اور ان کی ارواح یکساں حاضر ہیں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ صحابہ نے کسی مردہ بزرگ سے توسّل نہیں کیا لہٰذا یہ فعل ناجائز ہے۔ اگر ایسا ہو تو ہر وہ فعل ناجائز قرار پائے گا جو زمانۂ رسالت یا عہد صحابہ میں نہیں ہوا، اور اس طرح مباحات کا دائرہ بہت ہی تنگ ہو جائے گا۔ جن امور کے متعلق نفیاً و اثباتاً کوئی حکم وارد نہیں ہوا ہے اور جن کا رواج عہد صحابہ میں بھی ثابت نہیں ہے ان کو زیادہ سے زیادہ امور مسکوت عنہا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر قطعیت کے ساتھ ان کے عدم جواز کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، بلکہ اہل اصول میں سے جو لوگ اباحت کو اصل قرار دیتے ہیں وہ تو ایسے امور میں جواز کی طرف جائیں گے۔ آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى الخ سے بھی استدلال درست نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے معنی زیادہ صحیح سمجھتے تھے۔ آپ نے حج بدل کو جائز قرار دیا اور اس کی دلیل میں ارشاد فرمایا کہ اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اس کو ادا کر دے تو یہ تیرے باپ کے لیے نافع ہو گا۔ اسی طرح آپ نے متوفی کی طرف سے قربانی کرنے کو بھی جائز و نافع قرار دیا اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ ایک قربانی آپ کی طرف سے کیا کریں۔ روزے کے متعلق بھی آپ کا ارشاد ہے کہ من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیہ (جو شخص مرجائے اور اس کے روزے چھوٹ گئے ہوں، اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے)

اگر آیت مذکورہ کا مفہوم یہی ہوتا کہ ایک شخص کا عمل صالح اس کی اپنی ذات کے سوا دوسروں کے لیے نافع نہیں ہو سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے احکام ہرگز نہ دیتے۔ پس مردہ بزرگوں کے عمل صالح اور ان کی حرمت کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کے ناجائز ہونے پر کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں، اور جس چیز سے خدا و رسول نے منع نہ کیا ہو اس کو ممنوع قرار دینا گویا شریعت میں اضافہ کرنا ہے۔ یہ بھی بدعت کی ایک قسم ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محرم الحلال کمستحل الحرام (حلال کو حرام قرار دینے والا ایسا ہی ہے جیسا حرام کو حلال قرار دینے والا)

اس طرح کے تشدد کی بعض اور مثالیں بھی اس کتاب میں نظر پڑیں۔ مگر ان سب کا ذکر اس مختصر تبصرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مقصد صرف اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ استیصال بدعات کے جوش میں حد سے گذر جانا مناسب نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جوش میں آپ خود ایک جوابی بدعت کے مرتکب ہو جائیں۔ (ا - م)

خزینۃ المیراث تالیف مولوی فتح الدین صاحب خوشابی ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۸؍ محمد شریف عبدالغنی صاحب تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

اس کتاب میں اسلامی قانون وراثت کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور قریب قریب تمام ممکن الوقوع صورتیں فرض کر کے تقسیم وراثت کے جزئیات درج کر دیئے گیے ہیں۔ آخر میں مذہب شیعہ کے احکام وراثت اور ہندو دھرم شاستر کے قانون توریث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کاغذ اور کتابت دونوں بہت ناقص ہیں (ا - م)

قادیانی مذہب تالیف جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی۔ (ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ) ضخامت ۹۲۶ صفحات قیمت ؏ کمال احمد صاحب فاروقی۔ بیت السلام۔ حیدر آباد دکن۔

اس کتاب کا ارتقاء حیرت انگیز ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۲۰ صفحات کا تھا۔ دوسرا ۲۴۰ صفحات کا ہوا۔ تیسرا ۴۰۰ صفحات تک پہنچ گیا۔ اور اب یہ چوتھا ایڈیشن ہے جس کو اگر الفیہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کا مواد مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کے خلفاء "صحابہ" (بلا تشبیہ) اور ائمۂ قادیانیت کی تقریباً ۱۰۰ کتابوں اور "صحیفوں" سے اخذ کیا ہے۔ ان میں بکثرت ایسی کتابیں بھی ہیں جو قادیانی مذہب میں راسخ ہو جانے سے قبل کسی کو نہیں دکھائی جاتیں۔ مؤلف نے کافی جہاد کے بعد اس محفوظ ذخیرہ کا ایک معتد بہ حصہ نکلوایا ہے، اور اس سے عام پبلک کو استفادہ کا موقع دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب قادیانی مذہب کے متعلق معلومات کا بہترین مجموعہ بن گئی ہے، اور معلومات بھی ایسی ہیں جن کے مستند ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس میں مرزا صاحب اور ان کے اکابر متبعین کی عبارتیں لفظ بلفظ نقل کر دی گئی ہیں اور ان کے مآخذ کے پورے پورے حوالے دیے گئے ہیں۔ مؤلف کا حصہ اس کتاب میں اگر کچھ ہے تو وہ صرف اس کی سائنٹفک ترتیب ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور معقول آدمی کسی مذہب اور اس کے بانی کے متعلق تحقیقی رائے قائم کرنے کے لیے جس قدر معلومات حاصل کرنا چاہے گا وہ قریب قریب سب یہاں موجود ہیں اور ایسی مرتب اور مفصل ہیں کہ ایک ایک پہلو اپنے اپنے مقام پر نمایاں ہو گیا ہے۔ مرزا صاحب کی سیرت، ان کے دعووں کا تدریجی ارتقاء، ان کی مذہبی تعلیمات، ان کے الہامات، انگریزی حکومت کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات، غیر قادیانی مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے متعلق ان کا مسلک، ان کے خلفاء اور اکابر "صحابہ" کی سیرتیں، ان کے متبعین کے [illegible] اور ہر ایک کے عقائد و مسائل اس طرح واضح کر دیے گئے کہ شاید اب اس سے زیادہ توضیح ممکن نہیں۔ مؤلف نے کسی بحث و استدلال کی کوشش نہیں کی، اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ مرزا صاحب اپنے منہ سے آپ بول رہے ہیں۔ قادیانیت خود اپنا اظہار کر رہی ہے۔ اب یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر کسی شخص کا ضمیر ایسے مدعی نبوت کو نبی ماننے اور اس کے مذہب کو مذہبِ حق سمجھنے پر آمادہ ہو تو اس سے بحث بیکار ہے۔ وہ ایک ناقابل علاج مریض ہے جس کا مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ (ا-م)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتداء میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹری نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدنِ عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء

کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امریکن بلاک (۶۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیحضرت فرمانروائے دکن (مد ظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپیے بعد طبع پچیس روپیے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر روزگار کتابوں کے لئے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پبلشرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)